

ہمارے انتہائی ہنگاموں سے بھرپور سنسنی خیز ناول

پراسرار شکاری

ایم الیاس



میرے ڈھاکا رپورٹ پر قدم رکھتے ہی خونی کھیل کا آغاز ہو گیا تھا۔

میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا استقبال اس سنسنی خیز انداز سے ہو گا۔ میں طیارے سے اتر کر دوسرے مسافروں کے ساتھ لاؤنج کی طرف بڑھتا تو میں نے لاؤنج کے باہر دروازے کے پاس اپنے دیرینہ دوست انور ندیم اور پریس کلب کی سیکرٹری اور روزنامہ اتفاق کی کالم نویس مس نجم النہار کو کرشنا پورا کے پھولوں کے ساتھ اپنے استقبال کے لئے موجود پایا۔ میں اس مرتبہ تین برس کے بعد ڈھاکا آیا تھا۔ ان کے لبوں پر تبسم کی کلیاں چمک رہی تھیں۔

جب میں ان کے قریب پہنچا تو سب سے پہلے انور ندیم نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا 'پھر وہ بڑی گرجو شمی سے مجھ سے بغلیں ہو گیا پھر نجم النہار اپنا دلکش تبسم مجھ پر نچھاور کرتی ہوئی میرے قریب آئی اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے میرے گلے میں ہار پہنایا 'سلام کیا اور پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ اس ہاتھ کا لطیف لمس میری رگ رگ میں بجلی کی لہر بن کر اتر گیا اس نے اپنی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔

میں نے نجم النہار کو اوپر سے نیچے تک دیکھا جو بنگالی حسن کا نادر نمونہ تھی۔ ان تین برسوں میں اس کا حسن اور دلربا ہو گیا تھا وہ کوئی نو عمر لڑکی نہ تھی بلکہ تیس برس کی عورت تھی۔ سرخ کناروں کی سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں لمبوس تھی۔ چہرہ میک آپ سے عاری تھا۔ لمبے لمبے سیاہ ریشمی بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اتنے دلکش انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سادگی میں بڑا حسن تھا۔

وہ مجھے اپنی طرف اس طرح دیکھتے پا کر سرخ ہو گئی اس نے دل فریب انداز سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں؟"

"نہیں....." میں نے جواب دیا۔ "تم اپنی عمر سے دس برس چھوٹی لگ رہی

کی بو محسوس ہوئی بلکہ میری چھٹی جس بیدار ہو گئی۔

لوڈر میرا سامان لئے آگے آگے تھا اور کارپارنگ لائٹ کی طرف جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انورنیم تھا۔ پارنگ لائٹ پر نجم النصار کی گاڑی کھڑی تھی، میں اور نجم النصار ان دونوں کے پیچھے پیچھے چندہ میں قدم پر تھے۔ ہم دونوں باتیں کرنے میں ایسے منہمک تھے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ نجم النصار کو اچانک کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی وہ گرنے لگی تو میں نے سرعت سے اس کا بازو پکڑ لیا اس نے ایستادہ ہوتے ہوئے سامنے کی طرف دیکھا تو ایک دم الجھل پڑی پھر اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مجھے ایک طرف دھکا دیا اور خود بھی دوسری طرف ہو گئی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا زمین پر گر پڑا۔

فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، میں حیران تھا کہ نجم النصار نے مجھے دھکا کیوں دیا، میں سوچ رہی تھی کہ تھا کہ وہ پوری قوت سے جہاں انداز سے چھٹی۔ ”سالار!..... اپنے آپ کو بچاؤ وہ بد معاش تم پر فائدہ کرنے والا ہے۔“

نجم النصار نے جس طرف اشارہ کیا تھا میں نے اس سمت دیکھا تو سن سا ہو گیا، خوف کی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتار گئی وہ بد معاش مجھے میں نے کسم ہال میں دیکھا تھا اور جو ابھی مورس گاڑی کی طرف لپکا تھا وہ اس گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھا کھڑکی میں سے بددق کی نال میری طرف کر کے شست باندھ رہا تھا۔ پھر میں بغیر کسی تاخیر کے ایک طرف زمین پر گیند کی طرح لڑھکتا ہوا ستون کی طرف بھاگا، اس نے ایک فائر داغ ڈال کر میرے سر پر سے سنٹائی ہوئی گزرتی گئی مردو سرے لے آئی دل خراش چیخ فضا میں گونجی یہ گولی کسی اور کے جا کر گئی تھی۔ میں تیزی سے اٹھ کر ستون کی آڑ لے لیا، بھاگ۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ستون کی آڑ میں نہ ہوا جاتا تو دوسری گولی میرے لئے فرشتہ اہل ثابت ہوئی۔ دوسری گولی ستون سے ٹکرائی اور نہ جانے کدھر جا کر گئی میں نے بائیں جانب دیکھا پہلی گولی کا نشانہ ایک ٹیکسی ڈرائیو رہا تھا۔ گولی اس کی ران کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی وہ زمین پر کسی زخمی پر غصے کی طرح تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔

اس بد معاش نے جب یہ دیکھا کہ میں اس کے حملے سے بال بال بچ گیا ہوں اور میری بجائے دوسرا شخص اس کی گولی کی زد میں آ گیا ہے اور اس کا دوسرا فائر بھی خالی گیا ہے تو اس نے نجم النصار کو اپنے نشانے کی زد میں لے لیا، جو زمین سے اٹھ کر کدھر چلا خائف اور رجوا اس بانستہ ہو کر کارپارنگ لائٹ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اس بد معاش نے اچانک ہی

نجم النصار کا نشانہ لیا تھا۔ اس غیبت بد معاش نے فائر جھونک دیا تو گولی نجم النصار کے شانے پر جا کر لگی اور وہ کسی انوکھی طرح ٹھوکر قریب کھڑی گاڑی کے بوٹ پر منہ کے بل جا کر گئی، پھر اس کے منہ سے ایک دل دوزخ چیخ نکلی اور فضا میں دور تک گونج گئی پھر وہ گاڑی کے بوٹ پر سے پھسلتی ہوئی زمین پر ٹکرائی۔ اس کے شانے سے خون کا ایک فوارہ اہل پڑا اور اس کے لباس کو خون سے تر کرنے لگا۔

اس گاڑی میں ایک نہیں دو بد معاش تھے، دوسرا بد معاش تو شیئرنگ پر بیٹھا تھا، ان بد معاشوں نے شاید سمجھا کہ نجم النصار کا کام تمام ہو گیا ہے۔ ان کی گاری ایک جھٹکے سے بڑھی اس نے بڑی تیزی سے ایک چکر کاٹا اور مشن روڈ کی طرف پوری رفتار سے چل پڑی۔ میں نفرت اور غصے سے اندر رہی اندر چیخ و تباہ کیا تاہم گیا۔ میری جیب میں ریو الور تھا لیکن وہ کسی کام کا نہیں تھا اس لئے کہ اس کی گولیاں سوٹ کیس میں تھیں، میرا ریو الور بھرا ہوا تا تو دونوں بد معاشوں میں سے کوئی بھی اپنی جان بچا کر جانیں سکتا تھا۔

یہ خوفی واقعہ چشم زدن میں پیش آیا تھا۔ سیکورٹی گاڈز اور مسلح پولیس کے سپاہی حیرت سے دیکھتے اور سوچتے رہ گئے تھے۔ جب تک انہیں ہوش آیا اور وہ اس گاڑی کے پیچھے لپکے اتنی دیر میں ان بد معاشوں کی گاڑی یہ جا، وہ جا۔ دوسرے لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی پولیس کی جیب ان کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ مجھے پولیس سے اس غفلت، سست روی اور بے پروائی کی قطعی امید نہیں تھی۔ پولیس تیزی دکھائی تھی تو رشوت لینے اور شریف اور بے گناہ آدمیوں کو گرفتار کرنے میں۔

میں کو نہ این کر نجم النصار کی طرف لپکا، وہ گزشتہ پانچ برسوں سے میرے بہترین، مخلص اور بے حد بے تکلف دوستوں میں سے تھی اور میری کتابوں اور میرے کارناموں کی جذباتی حد تک قدردان تھی۔ آج اب وہ میری محسن بھی ہو گئی تھی۔ آج اس کی وجہ سے میں موت کے منہ میں جا رہے تھا۔ وہ غریب میری ہی وجہ سے ان درندوں کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اسے زخمی حالت میں بے ہوش دیکھ کر میرا دل حد سے سے جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی نبض دیکھی تو وہ چل رہی تھی اس کے زخم سے بہت سا خون بہہ گیا تھا اور ریزہ نہیں ہوا تھا۔

اور ہراساں بد معاش کی فائرنگ سے انٹرویوٹ کی عمارت کے باہر فضا میں چیخ دینا اور ایک بھگدڑ لڑنے لگی تھی۔ سب دہشت زدہ ہو گئے تھے جس کا منہ دھر کر ہوا تھا وہ اس طرف بھاگا۔ عمارت کے اندر بھی خوف و ہراس پھیل گیا تھا اس لئے کوئی مسافر باہر نہیں نکلا تھا،

”جی نہیں اسے ہمارے والے ہسپتال ہی لے آئیں اس کے علاج کے اخراجات ہم برداشت کریں گے۔“ میں نے کہا۔

ہم نے ایسولینس کا انتظار نہیں کیا، میں نے نجم النصار کا پرس انورندیم کو دیا اور نجم النصار کو اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھا اور اصرار لپکڑی کی گاڑی بھی اس نیکی ڈرائیور کی طرف بڑھی، تھوڑی دیر کے بعد ہماری گاڑیاں راستے میں تھیں تو کئی ایسولینس انرپورٹ کی طرف تیز رفتاری سے جا رہی تھیں، میں نے نجم النصار کو گاڑی کی پہچانی نفست پر لٹا کر اس کا سرائی گو دیکھ لیا تھا اس کے زخم پر دوا مل تہ کر کے رکھ دیا تھا کہ خون زیادہ نہ بے۔ وہ نیم بے ہوش کی حالت میں تکلیف سے بری طرح کرا رہی تھی۔

ہسپتال پہنچے ہی ان دونوں کو فوراً آپریشن تھیلر میں لے جایا گیا تھا، اس ہسپتال میں چوٹی کے ڈاکٹر اور بہترین موجود تھے۔

نجم النصار کی ماں، بہن شمس النصار اور بھائی تنزیل الرحمن ہسپتال پہنچ گئے، انورندیم نے انہیں ٹیلیفون کر دیا تھا، وہ سب بہت پریشان اور غم زدہ تھے۔ سرجن نے آپریشن تھیلر سے باہر آ کر بتایا کہ ٹکری کوئی بات نہیں ہے مگر ٹی شائے میں پوست ہوشی وہ نکال لی گئی ہے۔ مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہے، یہی اس نیکی ڈرائیور عبدال کے بارے میں بتایا گیا۔ ان دونوں کو خون دیا گیا تھا، اتفاق سے میرا اور نجم النصار کا ایک ہی گروپ تھا۔ چونکہ تین بولس خون کی ضرورت تھی اس لئے بھائی بہن کے علاوہ مجھ سے بھی لیا گیا تھا۔

میں جب کبھی بھی ڈھاکا آتا تھا نجم النصار کے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ لوگ مجھے اپنے ہی گھر کا فرد سمجھتے تھے، اس گھر سے قریبی اور دیرینہ مراسم اس لئے تھے کہ ماضی میں جب بنگلہ دیش نہیں بنا تھا یہ لوگ ہمارے پڑوسی تھے اور نجم النصار میری چھوٹی بہن کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، میں نجم النصار کے پاس رات کو رکتا چاہتا تھا مگر اس کے گھر والے نہیں مانے۔ شمس النصار اس کے پاس رک گئی یوں بھی اس کے ڈرپ لگی ہوئی تھی اور نیند کا انجکشن دیا ہوا تھا، صبح سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا اس کے گھر والے مجھے ساتھ لے گئے تو انورندیم بھی چلا آیا۔

اس مرتبہ جو میں بنگلہ دیش آیا تو صرف شکار کے لئے نہیں آیا بلکہ خاص طور پر مجھے میرے شکاری دوست ابو سرکار احمد نے مدعو کیا تھا۔ اس مرتبہ شکار کھیلنے کے بجائے ان سات اٹھ مشہور شکاریوں کو تلاش کرنا تھا جو دو سال کے اندر پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئے

تھے، پولیس اور خفیہ پولیس کے ادارے سرتو ڈکوشن کے باوجود بھی ان کی گمشدگی کا پتہ نہیں چلا سکے تھے، ان کی لاشیں تک دستیاب نہیں ہو سکی تھیں، ان میں ہر تھوڑے غیر ملکی شکاری تھے جو سندھ دین میں شکار کے لئے آئے تھے، وہ ڈھاکا سے ایک سٹیئر میں سندھ دین کے لئے روانہ ہوئے تھے، سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ سفر کے دوران سٹیئر سے غائب ہو گئے تھے۔ ان کے کردار میں سامان موجود تھا لیکن ان کا پتہ نہیں چلا تھا۔

ان غیر ملکی شکاریوں کی پراسرار گمشدگی پر ان کی حکومتوں نے بنگلہ دیش کی حکومت کو بلا کر رکھ دیا تھا۔ ابو سرکار احمد کے مدد سے گھرے مراسم تھے، ان کی خواہش تھی کہ میں یہاں آؤں تو دونوں مل کر ان لاپتہ شکاریوں کا پتہ لگائیں جن کی گمشدگی سے خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ میری ساتویں کتاب ”دسواں شکار“ جو شکار کے انتہائی سنسنی خیز اور حیرت انگیز واقعات پر مشتمل تھی، اس کا بنگلہ ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا، میری یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی تھی اور اس کا بنگلہ ترجمہ میرے بچپن کے دوست انورندیم نے کیا تھا اور اس کی تقریب رونمائی ڈھاکا کے پریس کلب میں میں لوہر کو منعقد ہونے والی تھی۔ شکار کے موضوع پر میری کتابیں لندن کا ایک بہت بڑا پبلشر ہماچا تھا اور اس کا ترجمہ تقریباً دنیا کی ہر زبان میں چھپتا تھا، میری ہر کتاب کے دس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے اور بھی شائع ہو رہے تھے۔ یہ میرا ذریعہ آمدنی تھا اور ان کتابوں کی بدولت میں آج ایک دولت مند آدمی بن گیا تھا مجھے ہر مہینے مختلف ممالک کے پبلشرز کی جانب سے ہزاروں روپے کی رقم رائٹنگ کے طور پر وصول ہوتی رہتی تھی۔ آج میں دنیا کے بہترین شکاریوں میں شمار کیا جاتا تھا اور میرے کارناموں کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوئی تھی۔

میں ان تمام برسوں کے عرصے میں لاپتہ منصوبہ اور افتادہ کے جنگوں میں شکار کر کے کراچی پہنچا تھا کہ ابو سرکار احمد کا خط ملا وہ میرے ساتھ ملایا اور میسور میں تھے، جہاں ہم نے شیر ہراوردیو قامت تین دن کا شکار کیا تھا۔ اب یہاں ایک ایسے شخص کا شکار کرنا تھا جو شکاریوں کا شکار کر رہا تھا، ایک بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ نادیہ دشمن کو شکاریوں سے ایسی کیا دشمنی تھی۔ ڈھاکا کے انرپورٹ پر جو واقعہ پیش آیا تھا اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ نادیہ دشمن میری آمد سے خوفزدہ ہے اس لئے اس نے مجھے انرپورٹ ہی پر ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنایا تھا جو نجم النصار کی وجہ سے بری طرح ناکام رہا تھا۔ ایک دوسری بات یہ

میرے لئے حیران کن تھی کہ نادیہ دشمن کو میری آمد کی خبر کیسے ہو گئی۔ میں نے اپنی اس حیرانی کا اظہار انور ندیم سے کیا تو اس نے بتایا نجم النصار نے تمہاری آمد کی خبر ملک کے تمام اخبارات میں شائع کرادی تھی اور اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم شکاریوں کی پراسرار گمشدگی کا کھوج لگاتے آ رہے ہو۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ ان شکاریوں کو کس لئے اغوا کیا جا رہا ہو گا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف شکاری ہی نہیں بہت سارے غریب اور خوبصورت جوان مرد، لڑکیوں اور عورتوں کو بھی اغوا کیا جا چکا ہے۔“ انور ندیم نے جواب دیا۔ ”ان سب کی پراسرار گمشدگی بھی ایک معمہ ہے۔ اغوا ہونے یا لاپتہ ہونے والوں کی لاشوں تک کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔“

”کیسے ایسا تو نہیں کہ کوئی بین الاقوامی گروہ انہیں اغوا کر کے پڑوسی ملک کے بیگار کیپوں میں پہنچا رہا ہو؟“

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ انور ندیم نے کہا۔ ”سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سینٹر سے جب کہ وہ اپنا سفر طے کر رہے ہوں شکاریوں کا لاپتہ ہو جانا حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہے ایسا لگتا ہے کہ انہیں جاوے کے زور سے غائب کر دیا جاتا ہے۔“

”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا دشمن مجھے سینٹر سے کیسے غائب کرتا ہے، اس نے ایک شیر بہر کو چھڑک کر چھانٹ لیا۔“

”سالار! تم ذرا ہوشیار اور محتاط رہنا۔“ انور ندیم نے مشورہ دیا۔ ”تم پر دوبارہ قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے۔ دشمن اپنی کمانی پر سبکی محسوس کر رہا ہو گا تمہاری زندگی ہم سب کو ہے حد عزیز ہے۔“

”یہ نادیہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ جو بھی ہے وہ ایک ذہین، بے حد ہوشیار اور خطرناک شخص ہے۔ وہ جو بھی ہو اور کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو مکافات عمل سے بچ نہیں سکتا۔“

”اس کی وجہ سے پورے ملک میں خوف و ہراس پھیلنا ہوا ہے اور غیر ملکی شکاریوں نے یہاں آنا بند کر دیا ہے۔“

”ایو سرکار! محکمہ تک وطن واپس لوٹ رہے ہیں؟“

”وہ کل یہاں تمہارے استقبال کے لئے منگا پور سے پہنچنے والے تھے مگر پہنچ نہ سکے بلکہ بنگال، صدارت مملکت کے کسی کام سے چلے گئے ہیں۔ تین چار دن میں ان کی واپسی متوقع ہے۔“

میں انور اور انور ندیم صبح ہسپتال پہنچے تو نجم النصار ہوش میں تھی۔ اس کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن خون زیادہ بہہ جانے سے اس پر غائب طاری تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر دلچسپ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”نجم النصار بولی۔“ ”جب سے اسے ہوش آیا ہے آپ ہی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ اب تک کوئی میں مرتبہ پوچھ چکی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آپ بھی دشمن کی نازنگ سے زخمی ہو کر کسی ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ اب اسے میری بات کا یقین آیا ہو گا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے میرے بارے میں ایک مرتبہ بھی پوچھا ہو گا۔“ میں نے ہنسر پر نجم النصار کے پاس پہنچنے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں.....؟“ ”نجم النصار کے چہرے پر گہرا استغیاب چھایا۔

”کیوں اور کس لئے..... تم خود ہی اس سے پوچھ لو..... اگر اسے میرا اتنا ہی خیال ہو تو پھر کیا تھا.....“

نجم النصار کے چہرے پر سرخی لہریں کر دوڑ گئی۔ وہ غائب سے بولی۔ ”بہتر ہے کہ اب تم کالم نوکسی شروع کر دو۔“

”تم کو ڈی دیر کے بعد نجم النصار کے گہروالوں کا گلی فون سننے کے لئے چلی گئی۔ انور ندیم ڈاکٹر سے ملے اور اس کی رپورٹ معلوم کرنے لگا تو ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نور سا چھایا۔

”تمہاری آنکھیں تو کچھ اور کم رہی ہیں؟“ میں اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

”کیا.....؟“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی پھیل گئی۔

”وہی جو تمہاری زبان کبھی نہ کہہ سکی؟“

”عورت کی زبان ہی اس کی آنکھیں ہوتی ہیں۔“ وہ رک رک کر کہنے لگی۔ ”تم شکاری، نگاہوں کی زبان کبھی نہ سمجھ سکے، اب چونکہ تم شاعر بننے جا رہے ہو اس لئے آنکھوں کی زبان کا مفہوم بھی سمجھنے لگے ہو۔“

”تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے ساری زندگی بھلا نہیں سکتا..... تم نے میرے لئے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی۔“

”کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں تمہارے لئے اپنی جان دے سکوں؟“ اس کی حسین آنکھیں پُر خم ہو گئیں۔

”اس تمہ سے واپس آنے کے بعد تمہیں سدا کے لئے اپنانے کی مہم..... سر کر کے رہوں گا۔“

فریج حیا سے اس کا چہرہ تھما اٹھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”تم سدا ہی سے میرے دل کے نماں خانے میں بیٹے ہوئے ہو۔“

انور ندیم بچے آواز دو رواڑا کھول کر کھڑا ہاری باتیں سن رہا تھا۔ جیسی خوش انصار بھی آئی تھی۔ اس نے آتے ہی انور ندیم سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا دیکھ رہے ہو؟“

”ایک طرف شیر کے شکاری کو محبت کا شکار کھیلنے دیکھ رہا ہوں۔ دوسری طرف ایک کالم نویس کو شاعری کرتے ہوئے۔“

تیسرے روز کی بات ہے ٹیلی فون کی مسلسل جتنی ہوئی گھنٹی نے مجھے مگرمی بند سے جگا دیا تھا۔ میں رات دو بجے اپنی آنکھوں پر کتاب ”پراسرار شکار“ کا آخری باب کھل کر کے سونے کے لئے بستہ ہو گیا تھا۔ میں بیدار ہوا تو مجھ پر مگرمی غنودگی طاری تھی اور آنکھوں میں اتنی بندھیر تھی کہ پلکیں ہی نہیں کھل رہی تھیں۔ میں نے اندازے سے اپنا ہاتھ سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھایا جس پر بیڈ لیپ اور ٹیلی فون رکھے تھے۔ میرا ہاتھ بیڈ لیپ پر پڑا تو میں نے ٹیبل کر اس کا فٹن تلاش کیا۔ دوسرے لمبے کمرے میں گھنٹی پر روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں ’میں نے بے وقت تمام پلکیں اوپر اٹھا کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میں دل میں حیران ہوا کہ اتنی رات مجھے کس کا ٹیلی فون ہو سکتا ہے۔ اس کمرے میں جو ٹیلی فون تھا وہ نشست گاہ کے ٹیلی فون سے منسلک تھا۔ ایک لمبے کے لئے میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا کہ کیسے ہسپتال سے مجھ انصار کی ماں نے تو رنگ نہیں کیا؟ وہ آج رات اپنی بیٹی کے پاس رہی مگر میں جیسے حالانکہ ان کے رتنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لئے کہ وہاں ایک نرس ڈیوٹی پر بھی تھی اور اس کے علاوہ مجھ انصار کی طبیعت تو آج بالکل ٹھیک تھی۔ وہ بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہو رہی تھی اور پھر آج میں سارا دن اس کے کمرے میں موجود رہا تھا۔ رات نو بجے وہاں سے اٹھا تھا اس لئے کہ اس کے سونے

کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت کے مجزنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے مختلف رپورٹیں دیکھنے کے بعد کل ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ نیچے کوئی ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجنے کی آواز سن کر بیدار ہو جائے گا اور ٹیلی فون پر بات کر لے گا۔ چند لمحوں تک کسی نے رسیور نہیں اٹھایا، میں نے ایک لمبے کے لئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر رسیور اٹھا لیا۔ میں نے رسیور کو کان سے لگا کر پیلو کیا تھا کہ دوسری طرف سے ایک حزن منی آواز لہرائی جس میں بلا کا کرب اور دکھ جھلک رہا تھا۔ ”کیا یہ مس نجم انصار کا کان کا ہے؟“

اس کالب و لوبہ پر اوصاف و شہت تھا۔ اس کے لمبے کی غصافت اور بات کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی بڑے ہسپتال کی تربیت یافتہ نرس ہے۔ نہ جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرا دلک تھیں میں بدل گیا کہ یہ ٹیلی فون ہسپتال سے آیا ہے۔ میں نے مرودہ لمبے میں جواب دیا۔ ”جی ہاں!..... فرمائیے؟“

”کیا میں مسٹر سالار احمد سے بات کر سکتی ہوں؟“ اس نے مودبانہ انداز سے کہا۔ ”جی..... میں سالار بول رہا ہوں۔“ اس انجی لڑکی کی زبان سے مجھے اپنا نام سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

”اوہ..... میرے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ سے رابطہ قائم ہو گیا۔“ اس نے جیسے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

یہ جان کر کہ یہ ٹیلی فون ہسپتال سے کسی نرس کا نہیں ہے بلکہ کسی اور لڑکی کا ہے اور وہ تنگ کرنے اور تفریق لینے کی غرض سے رات کے تین بجے ٹیلی فون کر رہی ہے، ایک طرف اطمینان سا ہوا دوسری طرف مجھے اس کے ناوقت ٹیلی فون کرنے پر سخت غصہ آیا۔ اخبارات کے ذریعے سے یہ خبر ہر کسی کے علم میں تھی کہ میں نجم انصار کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس لئے اس لڑکی نے ادھر کا نمبر گھما دیا تھا۔

”یہ کوئی وقت ہے ٹیلی فون کرنے کا.....“ میں غصے سے بھوک اٹھا۔ ”آئی ایم ویری دی ری سوری.....“ وہ معذرت سے آہستہ لمبے میں گونگوائی۔ ”آپ سے ایک بھدہ ضروری بات کرنا تھی۔“

”اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں.....“ میں نے حیرت اور غصے سے کہا۔ ”یہ وقت ایک شریف آدمی کے سونے کا ہوتا ہے۔ آپ بھی مجھے ٹیلی فون کر سکتی تھیں؟“ ”اگر اتنی اہم اور ضروری بات نہ ہوتی تو میں آپ کو رات دس بجے ہی ٹیلی فون کر

لتی۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کا ٹیلی فون ٹیپ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ٹیپ شاید نہیں ہو رہا ہے اس لئے میں نے آپ کو اس وقت زحمت دی۔“
”ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہے؟“ اس کی اطلاع پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ”کون ٹیپ کر رہا ہے؟“

”دبی جس نے ایئر پورٹ پر آپ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔“ وہ کہنے لگی۔ ”میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ ایک گھنٹے کے اندر اندر..... مجھ سے مل سکتے ہیں؟“

”کیا.....؟“ میں چونک پڑا۔ ”آپ مجھ سے کس لئے ملنا چاہتی ہیں.....؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ صبح سات بجے کے بعد کسی وقت یہاں تعریف لے آئیں۔“

”میں آپ کو ٹیلی فون پر بتا نہیں سکتی کہ آپ سے کس لئے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کا لہجہ ایک دم نہ اسرار سا ہو گیا۔
”مگر مختصر مدت رات کا وقت ہے اور اس وقت ملنا کسی طرح مناسب بات نہ ہوگی۔“ میں نے معذرت کی۔ ”آئی ایم سوری مس!“

”اس وقت ایک ایک لمحہ میرے لئے ہی نہیں آپ کے لئے بھی کتنا قیمتی ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے؟ سویرا کس نے دیکھا ہے مسٹر سالار!“ ایک لڑکتی لڑکی کی آواز ابھرا۔
”جی۔ پلیز! اس ملاقات کو آپ منج پر نہ ٹالیں۔ پھر اس ملاقات سے کف افسوس ملے سوا کچھ نہ ہو گا۔ آپ ساری زندگی بچھتا رہیں گے۔“

”آپ مجھ سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ صاف صاف بتائی کیوں نہیں کہ اصل بات کیا ہے۔“

”یہ ایک مجبوری ہے مسٹر سالار!“ وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”در اصل آپ سے ملنے کے لئے ایک اور شخص ہے جین ہے اور وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے آخری بار ملنا چاہتا ہے۔“

”دیکھئے مس.....“ میں نے ترختے لہجے میں کہا۔ ”میرے خلاف کوئی چال تو نہیں بچھا یا جا رہا؟“

”جی نہیں.....“ اس کے لہجے میں ہلکا سا کرب نمایاں تھا۔ ”میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ بد نصیب شخص میرے والد ہیں۔ آپ کے دوست ہی نہیں ہم جماعت

بھی وہ بچے ہیں بھگدیش بننے سے پہلے۔ وہ صرف آپ سے ملنے کے لئے موت سے لڑ رہے ہیں۔“

”ایک منٹ.....“ میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے ذرا سوچنے دو۔“
میں سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ اس لڑکی نے مجھے عجیب شخصے میں ڈال دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک تکشش سی ہونے لگی۔ یہ میرے لئے بے حد عجیب بات تھی کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے تین بجے مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کا باپ بھی مجھ سے فوری طور پر ملنے کا خواہشمند تھا اور وہ زندگی اور موت کی تکشش میں جھلا تھا۔ وہ میرا موت کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ معلوم نہیں یہ لڑکی کون تھی۔ اس کا والد کون تھا۔ اس کا کیا نام تھا۔ وہ میرا دوست بھی تھا۔ یہ کیرا سارا تھا۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کسی وجہ سے کچھ بھی بتانے کے لئے تیار نہ تھی۔

کیا مجھے اس شخص سے مل لینا چاہئے جو میرا دوست بھی ہے اور مرنے سے پہلے مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ آخر یہ شخص کس طرح سے موت کے منہ میں جا پہنچا.....؟ کیسے.....؟ میرے ذہن میں سوالوں کے زہریلے سانپ پھنکارنے لگے۔
میں نے بادل خواست اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں..... مگر آپ سے کہاں آ کر ملوں۔“

”رستہ کارین پارک کے عقبی حصے میں.....“ وہ بولی۔ ”آپ ابھی اور اسی وقت نکل رہے ہیں نا؟“

”جی ہاں.....“ مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے اس لئے کہ اتنی رات کو کسی سواری کا ملنا بہت مشکل ہے۔ ”میں نے جواب دیا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟ اور پھر میں آپ کو کیسے پہچانوں گا.....؟ آپ وہاں کس جگہ پر ہوں گی؟“ میں نے ایک سی سائنس میں اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

”میرا نام لکھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے سوا وہاں کوئی عورت تو کیا مرد بھی نہیں ہو گا۔ میں خود ہی آپ تک پہنچ جاؤں گی۔“

پھر ٹیلی فون کا سلسلہ یک نخت منقطع ہو گیا۔ میں نے ہستے سے نکل کر لائن آن کی اور ملحق غسل خانے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا کہ اگر میرا نامیدہ دشمن مجھے پہچانے کے لئے میرے لئے جال بچھا رہا ہے تو کوئی بات نہیں یہی ایک راستہ ہے اس تک پہنچنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے۔ مجھے کبھی اپنی جان کی پروا نہ رہی تھی اس لئے کہ موت کا ایک دن

معمین ہے اور میں نے ہمیشہ موت کو سر پر منڈلاتے دیکھا تھا۔ ایک شکاری جب شکار کے لئے جاتا ہے تو وہ موت کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے۔

میں نے اپنا دیو اور لورڈ کیا سوٹ کیس سے پھل مار چ نکالی، بچے بے آواز آیا۔ کسی کو جگا کر ان کی نیند خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی جاگتا ہو تا تو گاڑی کی چابی لے لیتا۔ انجم السار کے ہاں ایک نہیں دو دو گاڑیاں تھیں۔ میں چند لمحوں کے بعد گھر سے باہر آیا تھا۔ گھیاں اور سڑکیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ رات کا حسن نکھر آوا تھا ہوا میں خشکی تھی۔ گھاپی جاڑے کے دن تھے۔ میں کسی سواری کی تلاش میں چوراہے کی طرف بڑھا۔ یہ گلشن کا علاقہ تھا۔ یہاں دن میں کسی سواری کا ملنا مشکل ہوتا تھا اس لئے کہ یہاں بچلے اور کوٹھیاں زمین زور و لوگوں کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اس لئے یہاں کسی قسم کی سواری نہیں ملتی تھی اور پھر رستہ گریں پارک یہاں سے بہت دور تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر کوئی سواری نہیں ملی تو انجم السار کے ہاں کسی کو جگا کر گاڑی کی چابیاں لے لوں گا۔

میں چوراہے پر پہنچا تھا کہ میں نے مخالف سمت سے ایک ٹیکسی کو تیزی سے آتے دیکھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا مجھے مدد تھی۔ ٹیکسی میرے پاس آکر رک گئی۔ میں نے کھڑکی میں سر ڈال کر ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ”رمتا پارک چلو گے؟“

”رمتا پارک!.....!“ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے اوپر سے نیچے تک ایسی نظروں سے دیکھا جس میں نشے میں ہوں۔ ”رمتا پارک سر! اس وقت آپ وہاں جا کر کیا کریں گے؟ پارک تو رات آٹھ بجے بند ہو جاتا ہے۔“

”تمہیں وہاں چلنا ہے یا نہیں.....“ میں نے تندہ لہجے میں کہا۔ ”نہیں چلنا ہے تو جاؤ“ میں دوسری ٹیکسی لے لوں گا۔“

”کیوں نہیں چلوں گا سر! آپ جہاں کہیں لے چلوں گا۔ رمتا پارک کیا کو میلا“ چٹا گنگ راج شاشی، چلے بیٹھے، سر! ہمارا کام ہی آپ جیسے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔“ وہ سیدھا ہو گیا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر چھپل نشست کا دروازہ کھول دیا۔

ٹیکسی چل پڑی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟“

”قلم سنو ڈیو سے.....“ اس نے جواب دیا۔ ”اداکارہ نیتیا بوس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور اس کے پروڈیوسر کی گاڑی میں کسی نے پتھر کر دیا تھا میں ان دونوں کو

چھوڑنے آیا تھا۔ نیتیا پروڈیوسر کے گھر رک گئی وہ دونوں نشے میں دمت تھے۔“

میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لی تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بڑے بڑے انکشافات کرنا چاہتا ہے۔ میں براہ جہانکے لگاکڑی کا شیشہ اڑا ہوا تھا اور ٹھنڈی تیر ہو اندر آ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں ابھی تک نیند بھری ہوئی تھی اس لئے نیند کے جھوٹے آنے لگے تھے۔ پھر میں جیسے سوئی گیا۔

ایک ہلکے سے جھٹکے سے ٹیکسی روکی تو میری آنکھ کھل گئی۔ دھان منڈی کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے اس نے ٹیکسی روک لی تھی۔ یہاں سناٹا تاریکی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہوا؟ تم نے گاڑی کیوں روکی؟“

”انجمن میں شاید کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔“ اس نے مجھے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں کے آثارِ ثبات کو بدلے دیکھا۔ اس نے گاڑی کا انجمن بند نہیں کیا تھا۔ اس میں کوئی خرابی ہو گئی تھی تو اسے بند ہو جانا چاہئے تھا۔

”انجمن میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے یا تمہاری نیت میں..... گاڑی تو ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی، تم نے اسے روکایوں؟“

”آپ نے نشے میں بھی خوب اندازہ لگایا سر!“ اس نے استہزائی انداز سے ہنستے ہوئے باتیں ہاتھ سے وہ دروازہ کھولا جہاں میں بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں چونک پڑا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خوفناک قسم کا چاقو کھلا ہوا تھا۔ ”سر! ذرا شرافت سے اپنے بڑے کا دیدار تو کرادیں۔“

”اچھا تو تم ٹیر سے بھی ہو۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”تمہیں ٹیکسی چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ وحندہ زیادہ اچھا ہے۔“

”ٹیکسی چلانے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ جیسے مرے مل جاتے ہیں۔ باتیں مت کریں، جلدی سے بڑھ لائیں اور ٹیکسی سے اتر کے دو دو گیارہ ہو جائیں۔ ورنہ کل کے اخبارات میں آپ کی بھی خبر ہوگی۔“

”اچھا یہ لو.....“ میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال کر نکالا تو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے کھل گئیں۔ پھر اس کے ہاتھ سے چاقو پھوٹ کر گر پڑا۔ ”تمہیں کتنی مگوئیوں کی ضرورت ہوگی ایک“ وہ..... یا تن.....“

پھر وہ ایک دم سے بھاگا۔ اس نے مڑے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے گنتیش کی طرف دیکھا تو اس میں چاہی نہیں لگی تھی۔ جیسی اس کا انجن ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ میں نے باہر آکر زمین پر سے چاقو اٹھایا۔ قریب ہی بڑا سائین ہول تھا اس کے جال دار ڈھکن میں سے چاقو اندر ڈال دیا پھر ٹیکسی کا نمبر نوٹ کیا تاکہ پولیس کو ایسے ریزن کے بارے میں اطلاع کر سکوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں دوسرے ایک سائیکل رکشا آتا دکھائی دیا۔ اتفاق سے وہ خالی تھا۔ اسے ایک بست ہی بوڑھا آدمی چلا رہا تھا۔ رکشا میرے پاس آکر رک گیا۔ ”کہاں جانا ہے بڑے صاحب!“ اس نے پوچھا۔

میں رکشا کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”رہنا پاک..... جلدی چلو“ تیز تیز چلتا.....

”رہنا پارک.....؟“ اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔

”میں بلکہ زبان میں کہہ رہا ہوں فراموشی زبان میں نہیں.....“ میں نہ جانے کیوں چڑسا گیا تھا۔

اس نے رکشا چلانا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بست بوڑھا آدمی تھا۔ اس کا سر اور ہونٹ تھکے تھے۔ اس نے چار خانے کی لگی اور ایک بھورے رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے اوپر ایک بو سیدھ سوئٹر تھا۔ اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اس سفر میں وہ رکشا چلائے۔ بلکہ دیش میں وہ ایک بوڑھا نہیں تھا جو رکشا چلا کر اپنی زندگی کو کھینچ رہا تھا ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایسے ہزاروں بوڑھے تھے۔

”تم اس عریض بھی راتوں کی نیندیں حرام کر کے رکشا چلاتے ہو۔“ اس نے کہ مجھے سات جانوں کا پیٹ پانا پڑتا ہے۔ دن میں زیادہ آمدنی نہیں ہوتی اور ہزاروں رکشاؤں کی وجہ سے سواریاں نہیں ملتی ہیں۔ یوں بھی لوگ بوڑھے کے رکشا میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے ہیں اس لئے کہ انہیں جلدی ہوتی ہے۔“

”کیا رات میں سواریاں مل جاتی ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں نہیں.....؟ جیسے آپ مل گئے اس طرح چارچہ سواریاں مل جاتی ہیں اور رات بھی اچھا مل جاتا ہے۔“

”رات کے وقت کسی سواریاں ملتی ہیں؟“

”ہر قسم کی.....“ وہ گلدی پر بیٹھے بیٹھے میری طرف گھوم گیا۔ ”کوئی چاند کی تلاش میں نکلتا ہے تو کوئی نشہ خریدنے کوئی ہسپتال جاتا ہے تو کوئی ریلوے سٹیشن یا گھاٹ کی طرف۔“

تھوڑی دیر کے بعد رکشا رہنما پارک کے عقبی حصے میں جا کر رک گیا۔ میں نے اسے میں ٹاکا دیے تو وہ خوش خوش چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں تاریکی ٹانے میں ڈوبے ہوئے باؤل میں کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فضا پر ایک دیرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں ایک قریبی درخت کی طرف بڑھا۔ اس کے نیچے کھڑے ہو کر پارک کے اندر بھانک رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنی پشت پر کسی سخت چیز کی جھپٹ محسوس کی۔

ایک تیز و تند نسوانی آواز نے پوچھا۔ ”کون ہیں آپ؟“

”سالارا احمد.....“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کے حکم پر حاضر ہو گیا ہوں۔“

”حکم پر نہیں درخواست پر۔“ وہ بولی۔ ”سالارا نکل! میں صوبہ ہوں۔ حیرت ہے آپ نے مجھے آواز سے نہیں پہچانا.....“ اس نے میری پشت پر سے وہ سخت چیز ہٹائی۔ میں نے ہلٹ کر دیکھا تو اس کے خوبصورت ہاتھ میں پستول تھا۔

میں نے اپنی جیب سے پشیل نارچ نکال کر اس کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے نام بتانے کے باوجود میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ روشنی کے ہالے میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سترہ انچہ برس کی ایک خوبصورت اور معصوم سی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ مانوس مانوس سا لگا۔ وہ میرے اور قریب آگئی۔ ”نکل! آپ نے مجھے ابھی بھی نہیں پہچانا..... میں مشتاق چوہدری کی بیٹی ہوں۔“

”مشتاق چوہدری؟“ میری نظروں کے سامنے کوئٹہ سالیکال پھر مجھے یاد آگیا۔ یہ صوبہ تھی۔ تین برس پہلے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ ان تین برسوں میں وہ یکسر بدل گئی تھی۔ ”صوبہ!“ میں نے اسے شانے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”اب میں نے جسے پہچان لیا۔ وقت اور لڑکیاں اس قدر تیزی سے بدل جاتی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی ہیں۔“

”نکل! جلدی سے چلئے..... ڈیڈی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک سمت چل پڑی۔ چند قدم پر دو رختوں کے جھنڈ کے پاس اس کی نیلے رنگ کی ٹوپو یا کارول گاڑی کھڑی تھی۔ میں گاڑی میں اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ موقع بھی نہیں تھا۔ مشتاق چوہدری بلکہ ویش کے نامور

شکاریوں میں سے ایک تھے۔ جب بھی میں اور ابو سرکار احمد شکار کے لئے سندھ میں جاتے تھے وہ ساتھ ہوتے تھے۔

جب گاڑی تیز رفتاری سے دوڑنے لگی تو میں نے اس سے کہا۔ ”آپ نے مجھے ٹیلی فون پر نام بتادیا ہوتا میں سیدھے گھر پہنچ جاتا۔“

”ڈیڈی نے سختی سے منع کیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ نہیں چاہتے تھے کہ دشمن کو ان کی آمد کا پتہ چلے۔“

”کون دشمن.....؟ وہ کہاں گئے ہوئے تھے؟“

”وہی دشمن جو اب تک نہ جانے کتنے شکاریوں کو انگوٹھا چکا ہے اور سینکڑوں غریبوں کو انگوٹھا کیا ہے اور کرایا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ڈیڈی کوئی دو مہینے پہلے استنبہ سے جاتے ہوئے راستے میں لاپتہ ہو گئے تھے۔ وہ آج صبح ہی پہنچے ہیں۔ اس حالت میں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ زخموں سے بخو اور اس قدر دہشت زدہ ہیں کہ.....“ اس کی آواز بھرا مٹی اور گلے میں اٹکنے لگی تو وہ چپ ہو گئی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے دھمکتی نکل کر اس کے دامن میں جذب ہو گئے تھے۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”حوصلہ رکھو..... تمہارے ڈیڈی ٹھیک ہو جائیں گے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ان کے پہنچنے کی کوئی امید نہیں ہے انکل!.....“ وہ سسک پڑی۔

”یہ تم کیسے کہہ رہی ہو۔ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ باپ سی کفر ہے۔“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔“ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بہ دقت تمام رک کر بولی۔ ”معلوم نہیں ہم گھر پہنچیں گے تو وہ زندہ بھی ملیں گے۔ بس اب آپ دعا کریں۔“

دھان منڈی میں مشتاق چوہدری کا بنگلہ تھا۔ جلد ہی ہم پہنچ گئے تھے۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو بھالی نلیم ”صوبہ سے بڑی بہن صنم اور ایک دوست ڈاکٹر زبیر احمد موجود تھے۔ میں مشتاق احمد کے پاس بستر پر بیٹھا تو ان کے زور چہرے پر زندگی سی آگئی۔ ”سالارا تم آگئے.....؟“

ان کی آواز اور ہونٹ خوشی سے کانپنے لگے۔ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر خراشیں پڑی تھیں اور بدن پر چادر پڑی تھی۔ ”تم بہت اچھے وقت آئے۔ میں تھوڑی دیر کا مسمان ہوں۔“ انہوں نے رک کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ہر

کی طرح جھجکتا تھا۔

”فائدہ کرے دوست!“ میں نے ان کے ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ سے چھتہ پٹائی۔ ”باپ سی کفر ہے۔“ میں نے گردن گھما کر نلیم بھالی کی طرف دیکھا۔ ”آپ انہیں ہسپتال کیوں نہیں لے گئیں۔ ہسپتال میں فوری طبی امداد سے ان کی حالت تو سنبھل جاتی۔“

نلیم بھالی نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ان کے جذبات بے قابو ہو رہے تھے اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ دیوار کی طرف منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”ڈیڈی کسی قیمت پر ہسپتال جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ لہذا ڈاکٹروں کو گھر پر بلا کر دکھانا پڑا۔“ صنم بولی۔

”وہ کس لئے.....؟“

”اس لئے کہ..... وہ ہسپتال میں دم توڑنا نہیں چاہتے ان کی خواہش ہے کہ گھر میں ان کی زندگی.....“ اس نے اپنا جملہ ادھر ادھر چھوڑ دیا۔

”میں گھر میں پیدا ہوا اور گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔“ وہ نقاب سے بولے۔ ”یہ وقت بحث و تکرار کا نہیں ہے۔ میرے پاس تھوڑی سی زندگی ہے میں تمہیں اس شخص کے بارے میں بہت ساری باتیں بتانا چاہتا ہوں جو انسان نہیں درندہ ہے۔“

”کون ہے وہ.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں رہتا ہے؟ میں تمہارا اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔“

”وہ درندہ ہے سالار لیکن دیکھنے میں مذہب انسان لگتا ہے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”وہ کس جگہ رہتا ہے یہ میں نہیں جانتا..... وہ ایک جزیرے میں رہتا ہے۔ یہ جزیرہ کہاں ہے مجھے نہیں معلوم..... میں معجزاتی طور پر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ وہاں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ہے۔“

”کیا اس نے جزیرے پر اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے؟“

”ہاں.....؟“ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے چہرے پر ہلاکی تکلیف نظر آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد سننے لگا۔ ”اس نے زبردست پہرہ لگا رکھا ہے۔ اس کے بد معاش ساتھی اور ملازم ہر وقت مسلح اور چوکنار ہتھے ہیں۔“

”آپ وہاں سے فرار ہونے میں کس طرح کامیاب ہو گئے؟“

کرتا ہے اور ان کا گوشت کھا جاتا ہے یہ شخص کوئی جنگلی نہیں تھا۔ اس مذہب دنیا کا باشندہ تھا ایک مذہب اور تعلیم یافتہ شخص تھا اس نے میرے شکاری دوست مشتاق چوہدری کو ایک دروناک موت سے دوچار کیا تھا میں ایک شفیق انسان سے محروم ہو گیا اس کے گھر میں ایک اندھیرا چھایا تھا۔

میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس درندہ خصلت انسان کو موت کے گھاٹ نہیں اتاروں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا میں اس درندے کا شکار کروں گا۔ اس کا سارا جسم کرلیوں سے چھلی کر دوں گا۔

☆-----☆-----☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ نجم التمار اپنے گھر آگئی تھی۔ اسے ڈاکٹروں نے ایک ہفتے تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر اس نے ڈاکٹروں کی ایک نہ سنی۔ وہ انور ندیم کے ساتھ مل کر میری کتاب کی رونمائی کی تقریب منعقد کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گئی دوسری طرف سے اس نے مشتاق چوہدری کی موت پر اپنے اخبار میں حکومت کی بے توجہی، عدم دلچسپی اور پولیس کی بجرمانہ خاموشی پر ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ حکومت سے لے کر پولیس تک مل گئی۔ پھر سارے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور اس درندہ خصلت انسان کے خلاف جلوس بھی نکالے گئے اور حکومت نے اس شخص کے سر کی قیمت دس لاکھ کا مقرر کر دی۔

ابو سرکار احمد بھی منگوا کر رہے لوٹ آئے تھے۔ انور ندیم اور میں شام کے وقت ان کے گھر چلے جاتے تھے۔ پھر میں تینوں سر جو ڈکریٹھ جاتے تھے کئی دنوں سے ہم تینوں مل کر اس انسانوں کے پراسرار شکاری کے خلاف منصوبہ بناتے رہے تھے۔ مشتاق چوہدری کی موت نے مملکت دی ہوئی تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس جزیرے کو تلاش کریں۔ ممکن ہے یہ جزیرہ نہ ہو بلکہ رنگائی کا بگھل ہو۔ میری کتاب کی رونمائی والے روز سارے اخبارات میں ایک روح فرسا خبر چھپی کہ ایک اور شکاری ابو المنصور جو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ شکار کے لئے سندھ بہن راکٹ اسٹیج میں جا رہے تھے، وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئے تھے۔ ایک خبر اور بھی تھی کہ ایک لالچ جو چاند پور سے باری سال کی طرف جارہی تھی اس میں جو چالیس افراد سوار تھے وہ بھی لاپتہ ہیں جبکہ خالی لالچ باری سال سے دس گلو میٹر دور ایک گاؤں کے پاس مل گئی ہے۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق یہ حرکت اس درندہ خصلت شکاری کی تھی۔ ان

”یہ لمبی کمائی ہے جسے سانے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ موت مجھے مہلت نہیں دے گی۔“ وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگے۔

”کس شہر کے آس پاس ہے..... چٹا گنگ، باری سال، رنگائی، کاکس بازار اور.....؟“

”میرا ذہن کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے جھڑالیا۔

”میں تاریکیوں میں ڈوب رہا ہوں۔“

”اپنے آپ کو سمجھانے چوہدری صاحب! آپ بالکل ٹھیک ہیں آپ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔“

”اگلے سچ کہہ رہے ہیں ڈیڈی!“ صورت دوسری طرف آکر بہتر بیٹھ گئی۔

”وہ غیبیت چٹاریوں کا زبردست دشمن ہے..... انسانوں کا بھی دشمن ہے۔“ ان کی سانس تیز ہونے لگی۔

”وہ شکاریوں اور انسانوں کا شکار کر کے ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے؟“

”وہ.....“ وہ مجھے پچھلی پچھلی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ”وہ ان کا گوشت..... کھاتا ہے۔“

”اس لئے وہ انسانوں کا.....“

مشتاق چوہدری کی آواز ڈوبنے لگی۔ سانس ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر زہیر احمد نے قریب آکر ان کی نبض دیکھی، پھر میری طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر مایوسی کی گھٹا تھی۔

”آئی ایم سوری! اب کوئی امید نہیں رہی.....“

چند لمحوں کے بعد آخر موت نے ان کی ساتھ برس کی زندگی کو ٹکٹ دے دی اور ان کی گردن ایک طرف ڈھکی گئی تو ڈاکٹر زہیر احمد نے چادر کھینچ کر ان کے چہرے پر ڈال دی۔ پھر اس کمرے میں ایک کمرہ سا چھایا۔ صورت اب وہیں بیٹھنے سے لگ کر روئے گئیں۔ فضا میں بھلائی اور ان کی لڑکیوں کی آہیں اور سسکیاں گونجنے لگیں۔ میں اور ڈاکٹر زہیر احمد ان تینوں کو کمرے سے نکال لائے۔ ظلم بھلا بھلاؤں کھانے لگیں بھروسہ کھا کر بے ہوش ہو گئیں۔ وہ بیس برس کی رفاقت کے بعد اس دنیا میں اکیلی رہ گئی تھیں۔

میں دو تین دن ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ ایک طرف مشتاق چوہدری کی المناک موت سے میرے دل کو مراد احمد سے پچھتاوا دوسری طرف اس شقی القلب آدمی کی درندگی نے میری نفرت، غصے اور انتقامی جذبے کو اپنی انتہاک پہنچا دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دھرتی پر ایک ایسا خون آشام انسان بھی موجود ہے جو انسانوں اور شکاریوں کا شکار

دو خبروں سے پورے ملک میں ایک طوفان اٹھ کھڑا تھا۔

تیسری کتاب کی رونمائی کی تقریب ڈھاکہ پریس کلب کے سبز دارپر منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کے صدر بنگلہ دیش کے مشہور ادیب 'ڈرامہ نگار اور ناول نگار علاء الدین آزاد' تھے جو بنگلہ ادب میں اپنا زبردست مقام رکھتے تھے۔ مہمان خصوصی نڈل اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ میری کتابیں بنگلہ زبان میں ترجمہ ہو کر پہلے بھی شائع ہو چکی تھیں۔ ہر کتاب کے وہ س ڈائریکشن بھپ چکے تھے اور کئی کتابوں کے ایڈیٹن زیر طبع تھے۔ میں یہاں کے لوگوں کے لئے انجی نہیں تھا اس لئے اس تقریب میں میری توقع سے کہیں بڑھ کر لوگ جھڑپ ہوئے تھے۔ یہ تقریب حد کا مایاب رہی تھی۔ میری کتاب کے چھ سو نئے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے تھے۔ اس تقریب کی کامیابی پر نجم انصار کا بڑا ہاتھ تھا۔

تقریب کے اختتام پر نجم انصار اپنے گھروالوں کے ساتھ جلدی چلی گئی اس لئے کہ وہ بے حد تھک گئی تھی۔ علاء الدین آزاد نے مجھے اور نجم انصار کو دوسرے دن دوسرے کھانے پر مدعو کیا میں نڈل اکیڈمی کے ڈائریکٹر سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک بہت حسین اور نوجوان لڑکی میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ ڈائریکٹر صاحب نے مجھ سے رخصتی کی اجازت چاہی تو میں اس لڑکی طرف متوجہ ہوا۔ "فرمائیے۔"

"میرا نام جھمرا افتخار احمد ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ "میرے ڈیڈی ریٹائرڈ میجر جنرل افتخار احمد ہیں انہوں نے آج کی رات آپ کو کھانے پر مدعو کیا ہے کیا آپ غریب خانے کو روٹی بخشیں گے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔ "اس عزت افزائی کا شکریہ..... کیا یہ پروگرام کسی اور دن نہیں ہو سکتا۔"

"میں کوئی دو دن سے آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں آپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔" وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "میرے ڈیڈی چونکہ کل کراچی ایک مینے کے لئے جا رہے ہیں اس لئے وہ آج ہی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اس وقت انور ندیم میرے پاس آیا تو بھرنے اے سلام کیا وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ میں نے بھرنے والے کی دعوت کا ذکر کیا تو انور ندیم نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم ہو آؤ..... افتخار صاحب خود بھی ایک بہت اچھے شکاری ہیں۔"

میں دوستوں، صحافیوں اور مہمانوں سے مل کر بھرنے کے ہمراہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھا تو میرے بہت سارے مداحوں نے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی میرا راستہ

روک لیا۔ ان کے ہاتھ میں میری کتابیں تھیں۔ انہوں نے کتابوں پر آؤنگراف لینے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دی۔ بھرنے کی گاڑی پریس کلب کے باہر تھی بے مائل کی مرشد پر گاڑی تھی۔

میں دل میں حیران تھا کہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کے پاس اتنی قیمتی گاڑی کہاں سے آئی۔ بنگلہ دیش جانے کے بعد اور فوجی حکومت کے قیام نے ان فوجیوں کی تقدیریں بدل دی تھیں۔ آج وہ کسی سرباہ دار سے کم نہیں تھے ان کے گلشن، تانی اور دوسرے اچھے رہائشی علاقوں میں بیٹھے اور کوٹھیاں تھیں اور لاکھوں ٹاکا کی مالیت کے لوازمات سے آراستہ و پیراستہ تھیں۔

جھمرا کا گھر بھی تانی میں تھا۔ گاڑی خودی چلا رہی تھی۔ میں اگلی نشست پر اس کے پولیسو بیٹھا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا وہ میری ایک کتاب کا ذکر کر رہی تھی جو اے بے حد پسند آئی تھی۔ اس سے باتیں کرتے کرتے معامیری نظر غیبی آئینے میں پڑی تو میں چونک پڑا۔ میں نے ایک جپ کو غیر محسوس انداز سے تعاقب کرتے پایا۔ جھمرا گاڑی بڑی تیز رفتاری سے چلا رہی تھی گاڑی پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔

میں نے اس کی باتوں کے درمیان میں پوچھا۔ "تم کتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلا سکتی ہو؟"

"بہت زیادہ..... میں لندن میں دو مرتبہ تیز رفتاری سے گاڑی چلانے کے مقابلے میں پہلے نمبر پر آچکی ہوں۔"

"اگر میں ابھی اور اسی وقت تمہارا امتحان لینا چاہوں تو.....؟"

"محرور....." "سکرانی اور گاڑی کی رفتار بڑھانے لگی۔" آپ میرا امتحان کس لئے لینا چاہتے ہیں؟"

"اس لئے کہ پیچھے جو جپ آ رہی ہے وہ ہمارے تعاقب میں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے انٹر پورٹ پر میرے ساتھ پیش آنے والا وہ واقعہ بڑھا ہوا گاجس میں نجم انصار شدید زخمی ہو گئی تھی۔ ایک ٹیکسی ڈیوڈ ریم بھی..... آج پھر یہ بد معاش مجھے کوئی شان دار استقبالیہ دینا چاہتے ہیں۔"

"وہ بھول رہے ہیں کہ آپ ایک شکاری ہیں اور میں ایک جرنیل کی بیٹی....." وہ بے خوفی سے بولی۔

"میں جانتا ہوں کہ انہیں کسی سنان علاقے میں گھیرا جائے۔" میں نے جیب سے

دیتے ہیں۔“

”سات ہزار ٹاکا..... ہر کوئی اسے خرید نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا یہ عظیم تحفہ میں بھی اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔ یہ مجھے بیشاپ آپ لوگوں کی یاد دلاتا رہے گا ایک باہر پر اس تحفے کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔“

”اس بری شخص نے مجھے بتایا کہ یہ جوتے یورپ اور امریکہ میں پانچ چھ ہزار ڈالر میں فروخت ہوتے ہیں اور پھر یہ جوتے ایک عام شخص کی قوت خرید سے باہر ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یہ سارے جوتے ایک ہی دن میں فروخت ہو جاتے ہیں۔“

باپ اور بیٹی میرے گھر مجھے چھوڑ گئے تھے۔ واپسی میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ وہ جیپ البتہ وہاں نظر نہیں آئی شاید وہ بد معاش اسے وہاں سے لے گئے تھے۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے یہ انمول تحفہ نجم النصار اور اس کے گمراہوں کو بھی دکھایا۔ نجم النصار نے ان جوتوں کے بارے میں شانزدر تھا لیکن اسے ابھی تک انہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان سب نے جوتوں کو اس طرح حیرت سے دیکھا تھا جیسے وہ دنیا کا کوئی عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔ یہ جوتے واقعی کسی عجوبے سے کم نہیں تھے۔ میں انہیں رات گئے تک حیرت سے الٹ پلٹ کر اور پین کر دیکھتا رہا تھا۔ میں نے انور ندیم اور ابو سرکار احمد کو دوسرے دن یہ جوتے دکھائے تھے۔ اتفاق سے ابو سرکار احمد کے پاس اس کی ایک جوڑی تھی جو سفید رنگ کی تھی۔

میرے اور ابو سرکار احمد کے درمیان اس پراسرار شکاری کی تلاش میں نکلنے کے لئے ایک منصوبہ طے پایا۔ اس مہم کو سر کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ میں راکٹ اسٹیر سے خنڈر بن شکار کھیلنے جانے کے لئے کھانا روانہ ہوں۔ میرے کھانا روانگی اور شکار کے لئے جانے کی خبر تمام اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہو۔ اس خبر کو پڑھ کر وہ انسانوں کا پراسرار شکاری مجھے اغوا کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں سفر کے دوران جو شیار اور چوٹیاں گھر ہوں۔ کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے اس گردہ کے ایک آدمی کو قابو میں کر لوں۔

تیسرے روز منصوبہ کے مطابق ڈھاکا شہر کے تمام اخبارات میں میری کھانا روانگی اور سندھ دین کے جنگل میں شکار کھیلنے کی خبر نمایاں طور پر چھپ گئی۔ میں اس مہم پر روانہ ہو رہا تھا تو سب سے زیادہ اس نجم النصار تھی۔ بے حد فکر مند تھی اور رخصت کرتے وقت رو پڑی تھی۔ میں اسے دلاسا دے کر ناراض گنج چلا گیا۔ انور ندیم اور ابو سرکار احمد مجھے

فٹ آرہے تھے ان کے گدازے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے ریٹم ہو۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے جوتے پیک کر کے ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جوتے کیا یہاں تیار ہوئے ہیں؟“

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے مسٹر سار! وہ بولے۔“ جوتے یہاں تیار نہیں ہوئے بلکہ سال میں دو مرتبہ ایک بڑی بڑا شخص ان جوتوں کو لے کر فروخت کرنے آتا ہے وہ جوتوں کی سو ڈیڑھ سو جوڑیاں لے کر آتا ہے اس کے مخصوص گاہک ہیں وہ ان کے ہاتھ فروخت کر کے چلا جاتا ہے۔ صدر مملکت بھی اس سے جوتوں کی دو ایک جوڑی خریدتے ہیں۔“

”کتنے رنگ ہوئے ہیں ان جوتوں کے.....“ میں نے دلچسپی ظاہر کی۔ ”اس کالے رنگ میں بھی کچھ خاص اور چمک ہے کتنی کشش ہے۔“

”اس کے پاس دو تین رنگ ہوتے ہیں۔“ وہ بتانے لگے۔ ”یہ رنگ بھی انسانی جلد کی طرح سانولے، گہرے سانولے، سرخ و سفید اور بے حد سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں ہر رنگ اپنے اندر بڑی جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔“

یہ کس جانور کے چمکے ہوئے ہیں؟

”اس نے بتایا کہ برما کے جنگلوں میں ایک جانور پایا جاتا ہے اس کا نام ٹومی ہے یہ اس کی کھال سے بنتے ہیں۔ یہ جانور بہت کم پایا جاتا ہے یہ جانور سنا ہے نہ صرف بے حد خطرناک ہوتا ہے بلکہ ذہن بھی اسے پکڑنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔“

”پھر تو یہ جوتے بہت مہنگے ہوتے ہوں گے۔“ میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”جی ہاں.....“ وہ زیر لب مسکرائے۔ ”ایک جوڑی جوتے سات ہزار ٹاکا کے ہوتے ہیں۔“

میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ”سات ہزار ٹاکا.....؟ کیا اس کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے؟“

”بہت زیادہ تو ہے لیکن اپنی خوبصورتی اور خصوصیت کے لحاظ سے زیادہ قیمت نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص بات اور ہے وہ یہ کہ اس پر پالش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ یہ پلاسٹک اور بڑے جوتوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں آپ کسی بھی ایجنسی یا معمولی صابن سے دھوئیں ان کی چمک بڑھ جاتی ہے اور یہ بالکل نئے دکھائی

الوداع کہنے گھاٹ تک آئے تھے۔ ابو سرکار احمد دوسرے دن بذریعہ طیارہ کھلتا بیچ رہے تھے۔ کھلتا کے ایک ہوٹل میں کمرے بک کر لئے گئے تھے۔

میں نے فرسٹ کلاس اور ایئر کنڈیشنڈ کاکٹ لیا تھا۔ اسنیر روانہ ہوا تو میں نے فرسٹ کلاس کے مسافروں میں کوئی مشتبہ مسافر نہیں دیکھا۔ زیادہ تر حسین اور جوان جوڑے ہی سفر کر رہے تھے۔ مردوں میں میرے سوا ایسا کوئی نہیں تھا جو بغیر اپنی بیوی کے ہو۔ البتہ ایک عورت بیگم جمال چوہدری اکیلی سفر کر رہی تھی۔ یہ عورت ایک جوٹ مل کے منجری بیوی تھی۔ بلاشبہ یہ عورت حسین، طرح دار اور بھید پر کشش تھی۔ جس کھ اور لٹنر طبیعت کی تھی۔ اسے مطالعے کا بڑا چکا تھا کوئی نئی کتاب اس کے ہاتھ سے ہچتی نہیں تھی۔ وہ کہیں نمبر پندرہ میں تھی جبکہ میرے کہیں کابریئر تھا۔

اس نے مجھے لپک کے وقت ڈانٹنگ ہال میں اکیلا بیٹھا ہوا پایا تو پچان لیا۔ کتاب کی رونمائی کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ ساتھ میں میری تصویر بھی چھپی تھی۔ پھر وہ میری میز پر آئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ لپک کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی محبت کا نتیجہ ہے۔ شادی سے پہلے وہ اس کا شو ہرن لندن میں زیر تعلیم تھے۔ ان کی شادی کو دس برس ہو چکے تھے۔ اس کے دو بچے تھے جو لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

میاں بیوی ہر تین مہینے میں اپنے بچوں کو دیکھ آتے تھے۔

بیگم جمال کی وفات نے میرے سفر کا لطف دو بلا کر دیا تھا تاہم میں اپنی جگہ چوکنادور بے حد ہوشیار تھا۔ بیگم جمال کے شاید علم میں نہیں تھا کہ اسنیر کے سفر کے دوران شکاری پراسرار طور غائب ہو جاتے ہیں اور آج میرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ اگر اس کے علم میں ایسا کوئی واقعہ تھا تو اس نے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

صبح سے شام تک ہم اپنے اپنے کہیں میں بند ہونے کے بجائے عرشے پر آرام وہ کرسیوں پر بیٹھے چائے پیے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے میری نئی کتاب ایک ہی دن میں پڑھ ڈالی تھی اور اسے بے حد پسند آئی تھی۔ اس نے میری کتاب اور میری اتنی تعریف کی تھی کہ نیم النمار ساتھ ہوتی تو بل کر اسے دریا میں دھکا دے دیتی۔ میں نے اس کی باتوں، دزدیدہ نظروں اور حد سے زیادہ بے تکلفی کو محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ پر زبردستی فدا ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ یوں بھی مجھے اس کے خطرناک حسن سے خوف آنے لگا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نجم النمار کے سوا کسی اور عورت کے بارے میں سوچا بھی

نہیں تھا۔ یوں بھی میں ایک چالیس برس کا محض ختاب میرے لئے غم النہار کے سوا کوئی لڑکی یا عورت کشش نہیں رکھتی تھی۔ اس کا میری ذات میں حد سے زیادہ دلچسپی لینا اور ماحتر ہونا پسند نہیں آیا تھا۔

دن ڈوبنے کا نظارہ دیکھنے کے بعد وہ اپنے کہیں میں چلی گئی اور رات آٹھ بجے اس نے رات کے کھانے کے لئے ڈانٹنگ ہال میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔ میں ٹھیک آٹھ بجے ڈانٹنگ ہال میں ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوئی تو مرد اور عورتیں اور لڑکیاں اس کو دیکھنے لگیں۔ وہ اس قدر جگ جگ کر آئی تھی کہ اس کا حسن بے حد خطرناک ہو گیا تھا۔ اس کی حشر سامنا میں اس قدر واضح تھیں کہ انھیں اس کے چہرے اور سراپا پر فخر نہیں پاری تھیں۔ اس نے قیمتی زیورات بھی پہن رکھے تھے۔ آخر وہ ایک امیر کبیر آدمی کی بیوی تھی۔ وہ اپنے لباس، زیور اور شخصیت کی کیوں نہ ناکش کرتی۔

ہم دونوں رات کا کھانا کھا کر آئے تو دس بج رہے تھے۔ ہم نے کھانا مک کھایا، باتیں زیادہ کی تھیں۔ ہم دونوں اپنے کہیں کی راہ داری میں اپنے کہیں کے سامنے ریٹنگ کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے مگر میں چوکنادور اور میری جیب میں بھرا ہوا روپو موجود تھا۔ کوئی بھی مشتبہ آدمی نظر آتا تو میں اسے بخشتا نہیں۔ ریٹنگ کے پاس صرف ہم دونوں ہی کھڑے باتیں نہیں کر رہے بلکہ اندر بھی جوڑے تھے۔ باہر تاریکی تھی اور سرد ہوا دھل رہی تھی۔ راکٹ اسنیر تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

اس نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”اچھا سفر سالار! ایک بات تو بتائیں۔ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ ہمارے اس دیس میں ایک پراسرار جزیرہ موجود ہے جس کا وجود کوکوشش کے پتا چلا یا نہیں جاسکتا۔“

”میں نے بھی بس آپ ہی کی طرح سنا ہی سنا ہے۔“ میں بولا۔ ”اگر اس پراسرار جزیرہ کا وجود ہو تا تو اس کا نام تو ضرور ہوتا۔“

”جزیرے کا نام تو نہیں معلوم لیکن اس کے بارے میں بہت ساری عجیب و غریب اور پراسرار کہانیاں مشہور ہیں۔ ان کہانیوں کو سن کر مجھے بہت خوف آتا ہے۔“

”ہم لوگوں میں یہی ایک سب سے بڑی خرابی ہے کہ زارذاسی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن اس بات سے آپ انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ اسنیر کا سفر شکاریوں کے لئے بڑا

خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ دو سال کے عرصے میں جتنے شکاریوں نے اسٹیئر سے سفر کیا وہ نہ اسرار طور پر لاپتہ ہو گئے۔ اب تو سنا ہے کہ شکاری اسٹیئر سے سفر کرتے ہوئے بہت ٹھہراتے ہیں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں.....“ میں مسکرایا۔ ”اگر اس بات میں کسی قسم کی سچائی ہوتی تو میں بھی اسٹیئر سے سفر نہیں کرتا۔“

”میرے خیال میں ان شکاریوں کے ساتھ کچھ اور واقعات پیش آئے لیکن حکومت نے ان کی گمشدگی کو کچھ اور رنگ دے دیا۔“

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”حکومت کو ایسی باتوں پر پردہ ڈالنا خوب آتا ہے۔“

”آپ کو بھڑک بک سمت اندھیرے میں بہت دور ایک جزیرہ سا دکھائی دے رہا ہے۔“ اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”دیکھیے.....“

”مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔“ میں نے اس سمت اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ نے شام کے وقت چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ شکاری کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں وہ چار سو گز دور درجہاڑیوں میں چھپے ہوئے چوہوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ اب آپ چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع جزیرے کو نہیں دیکھ رہے۔“

”آپ کی خوبصورت آنکھیں غیر معمولی طور پر بہت تیز ہیں اور پھر میں ایک چالیس سالہ آدمی ہوں۔“ میں مسکرایا۔ ”میں اب رات کے وقت زیادہ دور کی چیز دیکھ نہیں پاتا۔“

”شکار تو آپ دن میں کھیلتے ہیں نا..... وہ کہنے لگی۔ ”میں نے سنا ہے کہ سمندر میں کانچنگ گھپ اندھیرے میں ڈوبتا رہتا ہے۔“

”جنگل، جنگل ہو تا ہے اور جنگل میں اندھیرا تو ہو گا۔ ویسے وہاں شکار کھیلنے میں لطف آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ یہ کھیل بہادر اور حوصلہ مند لوگوں کے لئے ہے۔ آپ کو زیادہ لطف کیا شکار کے کھیل میں آتا ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک ایسا کھیل جس کا کوئی ثانی نہیں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ اس نے تکرار کی۔ ”کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال سے زیادہ دلچسپ کھیل نہیں ہے۔“

”یہ دنیا کا سب سے شاندار، سنسنی خیز اور بے حد خطرناک کھیل ہے۔ اس کھیل کے آگے دوسرے کھیل کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔“

وہ کھکھلا کر ہنس پڑی تو فضا پر چھائی اداسی مٹ گئی۔ ”یہ کھیل صرف شکاری کے لئے شاندار ہو سکتا ہے شکار کے لئے نہیں۔“

”میرے خیال میں ہم فصولِ باتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ میں نے ایک لمحے کے لئے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کا حسن بھی رات کے حسن کے ساتھ ساتھ کھرتا جا رہا تھا۔ ”نیگم بھال! میں آپ سے ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حقیقت پسندی سے سوچیں اور دیکھیں تو آپ کو احساس ہو گا کہ اس دنیا میں صرف دو طبقے ہوتے ہیں۔

ایک شکاری اور دوسرا شکار..... میری یہی خوشی قسمتی ہے کہ میں ایک شکاری ہوں۔ اگر اس درندہ خصلت نہ اسرار شکاری سے میرا آمناسامنا ہو تو وہ میرے ہاتھوں سے کبھی بچ نہیں سکے گا۔“

”میرا بس چلے تو میں اس خبیث بھینڑیے کو ڈھا کا شکر کے بیج چوراہے پر پھینا دے دوں۔“ اس کا چہرہ تھمتا گیا۔

”آپ کو وہ جزیرہ اب بھی نظر آ رہا ہے جو تھوڑی دیر پہلے آپ کو تاریکی میں نظر آ رہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

اس نے اس سمت دیکھا جہاں اسے جزیرہ نظر آیا تھا۔ ”شاید وہ جزیرہ پیچھے رہ گیا ہے اب نظر نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ وہ جزیرہ دیکھ کر کچھ پریشان اور خوفزدہ سی ہو گئی تھیں۔“

”صرف میں ہی نہیں سارے لوگ اس جزیرے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس جہاز کا کپتان، عملہ اور کینین کے ملازمین تک..... اس لئے کہ اس درندہ خصلت شخص کی حکومت اس جزیرے پر ہو گی۔ سفر کے دوران جو لوگ غائب ہو جاتے ہیں وہ یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کتنے دکھ اور رنجرت کی بات ہے کہ حکومت نے آج تک کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اس جزیرے پر جا کر لوگوں کے خدشات دور نہیں کئے۔“

”بات یہ ہے کہ جزیرہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں انسان تو انسان جانور بھی رہتا پسند نہیں

کریں گے۔ جس جزیرے کی آپ کی بات کر رہی ہیں میں نے اسے دن میں دیکھا ہے۔ یہ ایک غیر آباد اور خوفناک قسم کا جزیرہ ہے۔ اگر یہ کسی لائق ہوتا تو یہاں انسان اب تک آباد ہو چکے ہوتے۔“

”آپ نے ایک بات خاص طور نوٹ کی ہو گی کہ شام ہوتے ہی جہاز کے ملاح پکستان اور دوسرے ملازمین بہت خوفزدہ نظر آئے گئے۔ جب اسٹیمر اس جزیرے کے قریب سے گزر رہا ہے تو ان سب کا دہشت سے برا حال ہو جاتا ہے۔“

”ہاں! یہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی۔ میں نے پکستان کبیر احمد اور اس کے ماتحت ڈیٹان کو بدحواس پایا تھا۔“

”پکستان کبیر احمد کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ایک بہادر اور مدبر شخص ہیں اگر انہیں دشمنوں کے گروہ میں جا کر لڑنے کے لئے کہا جائے تو انکار نہیں کریں گے۔ میں نے آج انہیں بھی پریشان پایا۔ ان کی آنکھوں سے ایک خوف سا جھلک رہا تھا۔ میں نے ان سے بہت کزید اور اس جزیرے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ..... یہ پراسرار جگہ بہت بدنام ہے، صرف مسافری نہیں ملاح بھی بہت خوف کھاتے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا آپ کو کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا؟ میں نے کہا نہیں..... اگر خوف ہوتا تو میں اکیلی سفر نہ کرتی۔ ہوائی جہاز سے چلی جاتی۔“

”آپ نے ہوائی جہاز سے سفر کیا نہیں کیا جبکہ آپ ایک گھنٹے میں کھانا پہنچ جاتیں۔“

”اس لئے کہ مجھے ہوائی جہاز کے سفر سے خوف آتا ہے اور ریل اور بس سے سفر کرنے میں آگاہت اور اذیت محسوس ہوتی ہے۔ اسٹیمر کا سفر مجھے زیادہ آرام دہ اور اچھا لگتا ہے۔“

”آپ کو اسٹیمر اور اکیلے سفر سے اجتناب کرنا چاہئے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔“ وہ ساڑھی کا پلو شانے پر درست کرنے لگی۔ ”میں کوئی دو تین مرتبہ اکیلی سفر کر چکی ہوں، ڈھاکا اور کھانا۔ پچھلی مرتبہ جب اسٹیمر جزیرے کے قریب سے گزر رہا تھا تب میں نے اپنے بدن کے ایک ایک حصے میں برقائی ہوائی سی لہریں محسوس کی۔ اس روز گری تھی۔ جس تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ مجھ پر دہشت کا حملہ ہو گیا اور میں کانپنے لگی۔ ایک ملاح نے بھی اپنی اس کیفیت کا مجھ سے ذکر کیا تھا۔“

”ایسا کیسے؟“ وہ محسوس ہوا ہو گیا پھر انہیں غیبتی طور پر آپ نے محسوس کیا ہو گا۔ نچلے طبقے میں تو ہم پرستی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک ملاح کی تو ہم پرستی پورے جہاز کو خوف میں مبتلا کر سکتی ہے لہذا آپ نہ تو ان سے باتیں کیا کریں اور نہ ان کی باتیں سنا کریں۔“

”ممکن ہے آپ سچ کہہ رہے ہوں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”میں نے ایک انگریزی ناول میں ایک جگہ ملاحوں کے بارے میں پڑھا تھا کہ بعض اوقات ان کی جھنڈی جس بہت تیز ہو جاتی ہے جو انہیں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیتی ہے اور پھر یہ بات مسلم ہے کہ بڑی بھی آواز اور روشنی کی طرح لہروں میں سفر کرتی ہے۔ اگر ایک بڑی جگہ سے کوئی برائی کی لہر اٹھتی ہے تو وہ سینکڑوں میل تک سفر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح سے جن لوگوں کی جھنڈی جس بہت تیز ہوتی ہے وہ ان لہروں کو فوری طور پر محسوس کر لیتے ہیں اس لئے ایک ملاح کی باتوں کو تو ہم پرستی کا نام نہیں دے سکتے ہیں۔“

میں نے راہ داری کا جائزہ لیا۔ یہودیوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ راہ داری خالی پڑی تھی اور خاموش فضا چھائی ہوئی تھی اور لہروں کا شور گونج رہا تھا۔ کسی کا نام دستان نہیں تھا۔ میں نے اپنی دوستی گھڑی میں وقت دیکھا تو گیارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ آسمان کے افق پر نظریں جمائے کسی موج میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”اب وہ محسوس جزیرہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

”اب چل کر سونا چاہئے۔ چلے۔“

”اوہ! کے بائی۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ساڑھی کا پلو درست کیا۔ ”صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہو گی شب بخیر۔“

پھر وہ اپنے کیمین کی طرف بڑکی۔ اس کی کھال میں بڑی دلکشی تھی۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ اس کا حسن بلا حیرت تھا۔ مدنی نظریں تھیں کہ اسے دیکھتے بغیر مان نہیں رہی تھیں۔

اس نے اپنے کیمین کے پاس پہنچ کر اپنے بریس میں سے چابی نکالی۔ دروازہ کھول کر اندر جانے سے پہلے اس نے مجھے بخور لگا ہوں سے دیکھا۔ پھر دل فریب انداز سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میرے دل پر قیامت ڈھائی۔ جانے کیا ہوئے والا تھا۔

میں اپنے کیمین میں داخل ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی تک وہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا جس سے کئی شکاری موت کے منہ میں گئے تھے اور آج تک ان کا نام دستان نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس کے کوئی آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پروری طرح مستعد اور

ہو شیار تھا جب میں بھرا ہوا ریو اور کمرے کا دیدہ دشمن کے اختلا میں تھا میرے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے اور کسی آہستہ آہستہ کے خطرے وقت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔

اس اندیشہ کا کوئی جزا نہیں تھا کہ وہ نہیں آئے گا میں جانتا تھا کہ وہ آئے گا ضرور آئے گا اب تک اس نے نہیں آیا تھا کہ وہ بھی شکاری تھا۔ ایک اچھا اور ماہر شکاری، شکارم کرنے میں جلد بازی اور جھلک کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ میں بھی ایک شکاری تھا اور شکاریوں کی فطرت کو خوب سمجھتا تھا۔ آج ایک شکاری کا دوسرے شکاری سے مقابلہ تھا۔ دونوں شکاری ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

☆-----☆-----☆

کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ابھی تک وہ شکاری مجھے شکار کرنے کے لئے نہیں نکلا تھا۔ میری نگاہیں بدستور دروازے پر مرکوز تھیں۔ باہر ہر طرف گھراٹا ناٹاری تھا انجن چلنے کی آواز نغماتیں گونج رہی تھی اور اس میں لہروں کا شور مدغم ہو رہا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز تھا میری نظروں میں غم انسا کا چہرہ لہرائے لگا۔ غم انسا جو میرے دل کے کسی گوشے میں اس روز نے چھپی بیٹھی تھی جب سے اسے دیکھا تھا۔ میرے دل میں اس سے شادی کا خیال اس لئے نہیں آیا تھا کہ میں ایک شکاری بن گیا تھا شکاری کی زندگی ایک سلائی کی طرح ہوتی ہے اس وقت میرے دل میں غم انسا کے لئے اتنی شدید محبت نہ تھی۔ مجھے عورت اور اس کے حسن و شباب سے زیادہ شکار میں دلچسپی تھی۔ میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ میں جانتا تو میری زندگی میں ایک نہیں نہ جانے کتنی لڑکیاں اور عورتیں داخل ہوتی اور پہلی جاتیں۔ میری کمزوری عورت میں شکار تھا۔ میں اپنی زندگی کی لمبی لمبی اور سنسان راتوں میں کتابیں لکھتا رہا تھا اور ان واقعات کو قلم بند کرتا تھا جو میرے ساتھ پیش آتے رہے تھے اور میں ان کتابوں کی وجہ سے ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔

غم انسا پہلی عورت تھی جس نے میرے من کے دروازے پر دستک دی تھی پھر مجھے محسوس ہوا تھا کہ عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری اور بے کیف ہوتی ہے۔ زندگی کا اصل حسن عورت ہے قدرت نے اسی لئے تو عورت کو تخلیق کیا ہے اگر اس دنیا میں عورت نہ ہوتی تو پھر اس کائنات میں کوئی حسن اور کشش نہ ہوتی۔ اب میں بہت تھک چکا تھا میں نے اس مردود اور درندہ خصلت پراسرار شکاری کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد گھر ہانے کا تہہ کر لیا تھا۔

میرے تصور میں غم انسا مسکرا رہی تھی کہ اس کی جگہ بیگم جمال کے تراشیدہ

چکر لے لی اور غم انسا کا تصور دھندلا ہوتے ہوئے ایک دم سے مٹ گیا۔ اس کے پڑ شکوہ سراپا کی قیامتیں مجھے کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈسنے لگی تھیں اس کے حسین چہرے پر ایک دل خرب سی دک تھی اور گردن اوڑھنے پر دکھل مسکراہٹ رکھتا تھی۔ مجھ سے جیسے پوچھ رہی تھی..... کیا میں تمہاری غم انسا سے کہیں زیادہ حسین نہیں ہوں؟ میں نے فوراً ہی اس کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میرے دل کے نسا خانے میں جو فریم تھا اس میں صرف ایک ہی تصویر آویزاں ہو سکتی تھی۔ وہاں غم انسا کی تصویر آویزاں تھی اور پھر بیگم جمال ایک شادی شدہ عورت تھی۔ میں نے اسے صرف ایک دوست جانا تھا۔ اس کا خیال آنا میرے لئے حیرت انگیز تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت حسین، پُر شباب اور غیر معمولی طور پر پُر کشش تھی مگر میرے نزدیک کسی غیر عورت کے بارے میں سوچنا گناہ سے کم نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہو رہا ہے وہ مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے بے تاب ہو رہی ہے اور اپنی مرمریں دھکارتا نہیں پھیلا رہی ہے۔ پھر مجھے نیند کے جھوکے آنے لگے جیسے مجھ پر کسی پرانی شراب کا نشہ اثر کر رہا ہو۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ سونا میرے حق میں کسی بھی طرح اچھا نہیں تھا مگر نیند تھی کہ میرا شکار کرنے پر تلی ہوئی تھی اس شکاری سے مقابلہ کرنا میرے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا آخر میں اس کا شکار ہو گیا۔ میری آنکھ کی گلی کیسے لگی مجھے خبر نہ ہو سکی۔

میں نے نیند کے عالم میں سنا کہ کوئی میرا نمال لے کر پکار رہا ہے اور دروازے پر مسلسل دستک دے رہا ہے۔ میں نے نیند اور ہوتے ہی دروازے کی طرف دیکھا میرے کبین کے دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی آہستہ آہستہ مگر کسی کے پکارنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ایک دم سے اچھل کر بستر سے اتر آیا ایک سردی لہر میری دہلیز کی پٹی میں اتر گئی۔ میں نے ایک پہل خائف کے بغیر جب سے ریو اور نکال لیا میرا دشمن پراسرار شکاری میرا شکار کرنے کی غرض سے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ریو اور پر گرفت مضبوط کر لی اور دروازے کی طرف بڑھا قریب پہنچ کر کان لگا دیئے دستک تھی کہ بند ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

میں کرحش لہجے میں بولا تو میری آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ”کون ہے.....؟“

”میں..... میں ہوں مسٹر سالار! جلدی سے دروازہ کھولئے.....“ بیگم

جمال کی سرسراتی آوازیں خوف کا عنصر صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

میں نے جتنی گرا کر دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا تب تک جمال اس طرح سے کمرے میں داخل ہوئی جیسے کوئی غفرت اس کے تعاقب میں ہو۔ وہ حد درجہ خائف اور سراسیمہ سی تھی وہ جیسے اپنے حواس میں نہیں تھی اس نے اندر داخل ہوتے ہی جھکی کی تیزی کے ساتھ کہیں کا دروازہ بند کیا اور اس کی چٹنی چٹا دی۔ اس کے ہاتھ سے پرس فرش پر گرا اس نے اسے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی میں نے اسے اٹھا کر سائینڈ ٹیبل پر رکھ دیا وہ دروازے سے نیک لگا کھڑی ہو گئی اپنی آنکھیں بند کر کے لمبی سانسیں لینے لگی۔

وہ ریشمی سلینڈر سوٹ میں لمبوس تھی اور اس کے لمبے سیاہ ریشمی بال اس کے چہرے شانے اور پیش پے پر تہی سے منکمرے ہوئے تھے اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اور اس کی سانس دو ٹھکن کی طرح چل رہی تھی اور بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ لیا تھا تاکہ سانسوں پر قابو پایا جاسکے۔ میں دل میں ششدر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا جس نے اسے اس بری طرح حواس باختہ کر دیا ہے درندہ خصلت شکاری نے اسے اغوا کرنے کی کوشش تو نہیں کی ہو گی پھر ایک خیال اور آیا کہ کسی مسافریا اسٹمر کے محلے میں سے کسی نے اسے تھامنا شروع کر دیکھ کر اس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت تو نہیں کی۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے کہ وہ تھی ہی ایک ایسی حسین عورت کہ کسی بھی مرد کے دل میں اسے تھامنا شروع کر دیکھ کر نیت میں فوری تبدیلی آجائے مگر اسے اس وقت اس کے لباس اور جرجے میں مسافروں کو ادراک رکھ کر دیا ہو گا۔

میں نے ایک گھاس میں پانی بھر کے اس کے پاس جا کر اس سے کہا۔ ”بیگم جمال! آپ پانی پی لیں.....“

اس نے میری آواز پر اپنی پلکیں اٹھائیں اس کی حسین آنکھوں میں سے خوف، جھانک رہا تھا وہ کسی متوحش رہتی کی طرح ابھی تک بری طرح سہی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے سانسوں کے تلاطم میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی تھی۔ اس نے گھاس لینے کے لئے ہاتھ پیرا تو وہ کانپ رہا تھا اس نے میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اسے ایک ہی سانس میں خالی دیا۔ وہ خالی گلاس واپس کرتے ہوئے بولی تو اس کی آوازیں لرزیدگی تھی۔ ”بہت برا شکر ہے۔“

میں نے پانی ہاتھ میں گلاس پکڑا اور دائیں ہاتھ سے اس کا نرم و نازک پاؤں

اسے بستر کے پاس لے گیا اور بستر بٹھایا کہیں میں ایک ہی کرسی تھی میں اس پر بیٹھ گیا میں اس انتظار میں تھا کہ وہ داخل ہو تو میں اسے پوچھوں اصل ماجرا کیا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر سالار! آپ کی اجازت ہو تو میں تھوڑی دیر کے لئے بستر پر لیٹ جاؤں؟“

”مردو..... مردو.....“ میں نے جواب دیا۔ ”اس میں تکلف کی کیا بات ہے پلینز.....“

وہ بستر پر لیٹ گئی بستر پر جیسے ریشم کا گداز بکھریا جلیاں تھیں کہ ٹوٹ پڑی تھیں۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ”بیگم جمال! خیریت تو ہے؟ آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟“

جواب دینے سے پہلے اس نے اپنی لالچی لالچی پلکیں جھپکائیں اور ایک لمبی سانس لی پھر وہ اسٹگی سے کھنکے لگی۔ ”میں کہیں میں آکر کپڑے بدل کر سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو تیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار مجھے اس محسوس جزیرے اور اس درندہ خصلت شکاری کا خیال آ رہا تھا جو انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ اس خوف اور وحشت کے عالم میں نہ جانے کیسے میری آنکھ کھل گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد میں بیدار ہوئی تو میں نے کلک کی آواز سنی۔ میں نے لائٹ آن کر کے دروازے کی طرف دیکھا تو میرے سارے جسم پر سنسنی سی دوڑ گئی کوئی باہر سے تالے میں چابی ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ایک دم سے اچھل کر بیٹھ گئی پھر معامری نظر جتنی پر پڑی جو میں لگانا بھول گئی تھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ میں بستر سے اتر کر دروازے کی طرف جاؤں میں نے جلدی سے سائینڈ ٹیبل پر سے پرس اٹھا کر اس میں سے بے ہوش نکال لیا۔“

وہ توقف کر کے سانس لینے لگی اپنی بات جاری رکھنے سے پہلے وہ تکیوں کے سارے بیٹھ پڑی پھر دونوں ہاتھوں سے منکمرے ہوئے ریشمی بالوں کو سیٹھ کر انہیں جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے کھنکے لگی۔ ”دوسرے لمحے کھانک سے کہیں کا دروازہ کھل گیا پھر میں نے ایک چہرہ دیکھا جو بہت ہی خوفناک اور مکرہو قسم کا تھا میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی کمرہ ضرورت نہیں دیکھی۔ ایسا چہرہ کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔“ اس کے سارے بدن پر ایک جھرجھری سی جھیل گئی۔ ”اس کی آنکھیں لال لال اور مت ہی بڑی بڑی تھیں اتنی جھپانک تھیں کہ کیا تاؤں۔ وہ انگاروں کی طرح ہلک رہی تھیں۔ چہرہ مسوں، چھنی

تھائی، تینوں مجھے زہریلی انگلیں لگ رہی تھیں۔

”اچھا آپ آرام کریں۔“ میں یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں باہر کھڑا ہوتا ہوں تاکہ وہ شیطان آئے تو اس سے منٹ لوں۔“

”نہیں..... آپ باہر مت جائیں۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا۔ ”کیا معلوم وہ شیطان دوبارہ آجائے اور آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔“

میں اسے کیسے کہتا کہ اس شیطان سے زیادہ خطرہ تو تم سے ہے۔ میں نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ پھڑاتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری فکر نہ کریں وہ شیطان آیا تو میں اس سے منٹ لوں گا۔“

اس نے مجھے پھر سمجھانے اور روکنے کی کوشش کی۔ ”آپ یہ مت بھولیں کہ آپ ایک شکاری ہیں وہ درندہ خصلت شکاری، شکاریوں کا سخت دشمن ہے اور اس نے آپ جیسے شکاریوں اور سیکڑوں انسانوں کو ہضم کر لیا ہے یا پھر اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں نہ ڈالیں۔“

میں نے آگے بڑھ کر کہیں کا دروازہ کھولا اس کی خنور آنکھوں میں الجھ بھری تھی میں نے کہا۔ ”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کس طرح ہضم کرتا ہے۔“

میں کہیں سے نکل آیا راہ داری سنان اور دریاں پڑی تھی باہر گرمی تاریکی تھی باہر تیز ہوا تھی اور اس میں خشکی بہت زیادہ تھی۔ راہ داری میں روشنی جیسے ادھک رہی تھی میں دیکھ کے پاس کھڑا دھڑا کر دھڑکھٹنے لگا وہ شیطان آنسوئی کہاں سے آیا ہو گا؟ میرا ذہن سوچ رہا تھا۔ وہ کہاں چھپا ہو گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسٹیر کے عملے میں سے کوئی شخص ماسک چڑھا کر آیا ہو تاکہ اسے پیچھے جمال پھپھان نہ سکے۔ شاید اس نے میک اپ بھی کیا ہو شاید وہ اسٹیر کے اوپر والے عرشے میں چھپا بیٹھا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ درندہ خصلت شکاری کا کوئی آدمی ہو مگر وہ فیصلہ نہیں کیا؟ پیچھے جمال کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر کس لئے بھاگ گیا۔ ان باتوں سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ وہ بد معاش جہاز کے عملے میں سے تھا۔ اگر وہ درندہ خصلت شکاری کا کوئی آدمی ہو تو یقیناً مسلح ہوتا اور پیچھے جمال پراسرار طور پر لاپتہ ہو چکی ہوتی۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا میں اس شیطان کو تلاش کروں؟

میرے ذہن میں ایک کھٹک سی جاری تھی کہ میرے کہیں کا دروازہ کھلا پیچھے جمال کا چہرہ نمودار ہو پھر وہ دروازہ بند کر کے میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ بڑی حد تک ناراض ہو گئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے اعصاب مضبوط ہیں اس کی جگہ کوئی اور

واٹوں اور زخموں سے بھرا ہوا تھا وہ انسان نہیں شیطان تھا۔ میری نس میں نس برف اترنے لگی بدن کا سارا خون خشک ہو گیا اور جسم کی ساری طاقت جیسے سب کر لی گئی ہو پھر میرے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میری حالت ایک لرزے کے مریض کی سی ہو رہی تھی میرا پستول والا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ ”پلیز! ایک گلاس پانی دیجئے۔“

میں نے ایک گلاس پانی اس کی طرف بڑھایا تو اس نے پانی ایک ہی سانس میں حلق سے اتار لیا اس نے خالی گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا شکر کیا۔ ”وہ غبیث اندر داخل ہوا تو میری روح جیسے قتا ہو گئی۔ وہ میری طرف بڑھا تو اس کے پیچھے چہرے اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے ہوس اور درندگی جھانک رہی تھی۔ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میری رانی میں تمہیں لینے آیا ہوں.....“ ٹیبل پر پلے پلے تمام اپنی تمام طاقت جمی کی اور اس کی طرف پستول تان لیا شاید اس کی نظر پہلے پستول پر نہیں پڑی تھی وہ تو میرے چہرے کو گھور رہا تھا جیسے ہی اس کی نظر میرے ہاتھ اور پستول پر پڑی وہ بری طرح چوٹکا اور اگلے قدموں کرے سے نکل بھاگا۔ میں باوجود کوشش کے اس پر فائز نہ کر سکی۔ اس کے نکلنے ہی میں نے ہسٹرے اتر کر دروازہ بند کیا پھر پستول اوپر اس اٹھا کر باہر بھاگا۔ راہ داری سنان اور دریاں پڑی تھی پھر مجھے بہت زیادہ خوف محسوس ہونے لگا تو میں آپ کے کہیں پر آکر دروازہ بجانے لگی۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا یہاں آگئیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں آپ پوری طرح محفوظ ہیں۔“

”اگر میرے پاس پستول نہیں ہو تا تو آج میری عزت اور جان کی خیر نہ ہوتی وہ شاید مجھے اٹھا کر ہی لے جاتا۔“ وہ خوش سی ہو کر بولی۔

”پستول کیا آپ ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں..... اس لئے کہ یہ ایک طرح کا محافظہ ہوتا ہے اور پھر اس کی وجہ سے کئی مرتبہ میری عزت بچ چکی ہے۔“ اس نے بتایا۔

پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے میں نے ایک انجانا سا خطرہ محسوس کیا مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئے لگی دل کہیں جا رہا تھا اور دماغ کہیں۔ رات کی تھائی اور گرمی فوجی میں کوئی بھی طوفان اٹھ سکتا تھا ایک آتش نشین دیک رہا تھا جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ مجھے کبھی ایسی زندگی میں ایسی آزمائش سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ رات اور

”نہیں..... ابھی نہیں۔“ اس نے پانی کی لہروں پر نظرس جتاتے ہوئے کہا۔
”میں ایک گھنڈہ ادریاں کھڑی رہوں گی مجھے یہاں اچھا لگ رہا ہے۔“

وہ اندھیرے میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ ریٹنگ پر خطرناک حد تک جھکی ہوئی تھی
پھر اس نے ایک دم سے سیدھے ہو کر میرا نشانہ لایا اور بڑی انداز میں چیخا۔ ”سالارا!
مسٹر سالارا!..... یہ دیکھنے لاش تیرہی ہے۔“

”لاش..... کہاں ہے؟“ میں بری طرح چونک پڑا اور اس کی طرف دیکھنے
لگا۔ ”ادھر.....“ اس نے اشارے سے بتایا۔ مجھے لاش دیکھنے کے لئے ریٹنگ کے
پائپ پر کھڑے ہو کر خامسا جھکنا لاش اسٹیمر کے نیچے اور ساتھ ساتھ تیرہی تھی شاید
..... دوسرے لمبے جب مجھے اپنی حماقت اور اپنے خلاف ہونے والی سازش کا
احساس ہوا تب دیر ہو چکی تھی بیگم جمال نے میرے دونوں پیروں کو پکڑ کر اٹھایا تو میرا
توازن بگڑ گیا میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں سر کے بل پانی میں جا گرا۔

ایک شکاری نے دوسرے شکاری کو بڑی خوبصورتی سے شکار کر لیا تھا۔

☆-----☆-----☆

میرے پانی میں گرے ہی ایک زوردار جھپکا سا ہوا تھا اور رات کی گہری خاموشی
میں اس کا شور گونج کر سکوت میں ڈوب گیا۔ کسی نے اس شور کی آواز سنی نہ ہوگی اگر سنی
بھی ہوگی تو اس نے کوئی خیال نہیں کیا ہوگا اس لئے کہ ایسی آوازیں اسٹیمر سے کوئی نہ
کوئی چیز پانی میں پھینکنے سے بلند ہوتی رہتی ہیں اور پھر اس نے مجھے پانی میں گرتے ہوئے
دیکھا بھی نہ ہوگا اس لئے کہ آدمی رات کا وقت تھا اس وقت ہر کوئی کمری نیند کی آغوش
میں تھا اور ملال بھی اپنے اپنے کہیں میں آرام کر رہے تھے۔ یوں بھی اسٹیمروں سے
مسافروں کی نپراسرار کشمکش کی وجہ سے جو خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اس وجہ سے کون
جاننے کی کوشش کرے گا کہ یہ شور کس چیز کا تھا۔

میں نے فوراً ہی اپنے حواس کو قابو میں کر کے پانی کی سطح پر آنے کی کوشش کی اور
اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا جیسی میں نے بیگم جمال کی زہریلی ہنسی جو میرے
کالوں میں سیدھے بن کر کھینچنے لگی۔ میں نے غصے اور جھلاہٹ سے اسٹیمر کی طرف دیکھا جو
قریب ہی تھا یہ ایک بہت بڑا اسٹیمر تھا میں نے چننا چاہا تو ایک تیز لہر نے مجھے فوراً اپنی پلیٹ
میں لے لیا۔ میرے منہ ناک اور آنکھوں میں پانی بھر گیا میری چیخ نکلی نہ سکی دوسرے لمبے
میں سنہل کر چینٹا تو میرے اور اسٹیمر کے درمیان فاصلہ بڑھ چکا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا

عورت ہوتی تو وہ کہیں سے کسی قیمت پر نہیں نکلتی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”مسٹر سالار آپ واقعی ایک بہادر آدمی ہیں۔“

”جب تک شکاری بہادر نہ ہو وہ شکار کھیل ہی نہیں سکتا“ یوں بھی باہر کھڑے ہونے
میں بہادری کی کیا بات ہے؟“

”یہ بہادری کی بات نہیں ہے تو اور کیا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”یہ جانتے
ہوئے بھی آپ اس اسٹیمر سے سفر کر رہے ہیں کہ شکاری نپراسرار طور پر لاپتہ ہو جاتے ہیں
اور پھر اس وقت باہر کھڑے ہیں جب خطرہ منڈلا رہا ہے۔“

”ویسے آپ بھی کم بہادر نہیں ہیں۔“ میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا تو وہ
سرخ ہو گئی۔ ”میں نے بہت کم ایسی بہادر عورتیں دیکھی ہیں۔“

”میں اور بہادر.....؟“ وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”میں نے کیا
بہادری دکھائی.....؟“

”آپ نے اس شیطان کو بھگایا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کی جگہ کوئی اور
عورت ہوتی تو وہ بے ہوش ہو گئی ہوتی یا اس کا نشانہ بن جاتی۔“

”میں نے اسے کہاں بھگایا.....؟ وہ ہسپتال دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا میرے پاس
ہسپتال نہ ہوتا تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا؟“

”دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے اس واقعہ کا زیادہ اثر نہیں لیا آپ کی جگہ کوئی
دوسری عورت ہوتی تو وہ اب تک دہشت سے کانپ رہی ہوتی اور کہیں سے باہر آنے کی
جرات نہیں کرتی۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ آپ نے اپنے خوف پر پوری طرح قابو پا
لیا۔“

”آپ کی تعریف کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ میرے قریب آکر مسکرائے لگی۔
میں نے دسٹی کھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رات کا ایک بجنے میں تین منٹ باقی
ہیں آپ اپنے کہیں میں جا کر سو جائیں صبح ہونے تک یہاں کھڑا بہرہ ویتار ہو گا اور
ہاں اندر سے چٹخنی لگانا نہ بھولیں۔“

”رات کا ایک بجنے والا ہے.....؟“ وہ ایک دم سے چونکی پھر دوسرے لمبے
سنہل کر بولی۔ ”نہیں..... میں نہیں سوؤں گی اب مجھے نیند کہاں سے آئے گی۔“
”تو کیا آپ ساری رات جاگتی رہیں گی؟ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جائیں شاید نیند
آجائے۔“

تھا کہ پہلے جیسی ایک دوسری لہریری راہ میں حائل ہو کر مجھے ڈوبنے کی کوشش کرنے لگی چوں کہ میں ایک ماہر تیراک بھی تھا اس لئے اس لہر کا مقابلہ کر کے دیوانہ دارا استیمر کی طرف بڑھا پھر اپنی تمام قوت جمیع کر کے ایک زوردار چٹائی ماری اور جذباتی انداز سے چلائے لگا۔ ”بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ.....“

اس کے جواب میں ایک سنسنائی ہوئی گولی آئی اور میرے گمزمگئی گولی کی وجہ سے میں خوفزدہ ہو کر رک گیا اور میرے بدن پر چوبی نیلیاں سی بیگنے لگیں۔ پھر دوسری گولی مجھ سے ڈرا فاصلے پر پانی کی نذر ہو گئی۔ پھر میں نے پانی کے اندر سے تیرتے ہوئے استیمر کی طرف بڑھنا شروع کیا کیے بعد دیگرے دو اور فائر ہوئے جو خاصے فاصلے پر کئے گئے۔ میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد پانی کی سطح پر آکر دیکھا تو میرا حوصلہ جواب دے گیا اس کے اور میرے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ میں اب اسے پکڑ نہیں سکتا تھا ایک تو اس کی رفتار بہت تھی تیسری دوسری بات یہ تھی کہ اس کی تیز رفتاری جو لہریں چھوڑ نکلتی تھی وہ بہت بڑی تھیں۔ میرا جینٹا چلانا بھی بے سود تھا میری جینٹیں اس کے انجن کے شور میں دب کر رہ گئی تھیں۔

میں بڑی حسرت سے استیمر کو جاتا دیکھتا رہا اس کی جتیاں اندھیرے کی وسعتوں میں گم ہو گئیں اور گمرے سکوت کے باوجود اس کے انجن کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی میں چاروں طرف دیکھنے لگا گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ جھانکی نہیں دے رہا تھا کنارہ کہاں سے دکھائی دیتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس سمت ہوں۔

پانی بے حد سرد تھا اور رسی سی کسر خشک ہو ائے پوری کر دی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس جگہ ڈوب مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں کسی سمت تیرنا شروع کر دوں۔ میں تیرنے کے لئے اپنا جسم تول رہا تھا کہ مخالف سمت خاصے فاصلے پر روشنی کی کرن سی دکھائی دی کسی جھوپڑی میں جیسے چراغ جل رہا ہو یہ روشنی کی کرن میں تھی بلکہ امید کی کرن تھی کنارے کے وجود کی نشانی تھی۔

میں نے تیزی اسی سمت تیرنا شروع کر دیا تھا! اچانک ایک خیال میرے دل کے کسی گوشے میں آیا تو میں نے اپنی رفتار سست کر دی اور اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ یہ روشنی دشمن نے کی تھی تاکہ میں کنارے پہنچوں تو مجھے دھرا جائے بیگم جمال نے دانستہ مجھے ایسی جگہ دکھائے کہ اگر آتا تھا جہاں اس کے آدمی تھے اس طرح شکاریوں کا شکار کیا گیا تھا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ آدمی، میرے اشتعال، لے کے کنارے پر موجود ہو گا اس لئے

میں رخ تبدیل کر کے آہستہ آہستہ کتر تیرا جا رہا تھا میرا رخ سیدھا اور اس روشنی کی طرف نہیں تھا۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد میں نے کنارے پر پہنچ کر روشنی کی طرف دیکھا تو وہ شال میں نصف میل کے فاصلے پر محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے اتنا تو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ گاؤں ہے کوئی تیرہ نہیں میں کنارے پر بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا اور سر کے بالوں سے پانی کو ہاتھ سے نکالنے لگا بالوں کو دبا کر نچوڑنے پر پانی بسر نکلا تو بڑی دیر کے بعد میں مخالف سمت چل پڑا کوئی دو سو قدم چلنے کے بعد میرا اندازہ درست ثابت ہو آیا۔ ایک گاؤں تھا۔

چونکہ میرا جسم اور کپڑے بری طرح بھیگے ہوئے تھے اس لئے سردی سے برا حال ہو رہا تھا۔ میں جلد سے جلد ان کپڑوں اور لباس سے نجات پانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی جھوپڑی کے دروازے پر پایا جو سیاری، ماربل اور کھل کے اونٹے اونٹے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہاں ایک پرانیت سناٹا چھایا ہوا تھا اس جھوپڑی کے کینن گمری ٹینڈ سو رہے تھے۔

اس جھوپڑی کے کینن کو زحمت دینے کے سوا چارہ نہیں تھا میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں ان کی خدمت کا معقول معاوضہ دے سکتا تھا میں نے دروازے پر دستک دینے کے لئے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا کہ میں نے چاہی کسی کوئی اس طرف آ رہا تھا پھر میں نے ایک آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔ ”سالار ڈوب گیا یا کسی اور طرف نکل گیا روشنی دیکھ کر بھی اس طرف نہیں آیا۔“

”ڈوبنا تو خیر نہیں ہو گا۔“ یہ آواز دوسرے آدمی کی تھی۔ ”وہ شخص ہے بہت تیز اور ہوشیار..... اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔“

میں بے آواز اور تیزی سے اس جھوپڑی کے عقب کی طرف بڑھ گیا یہ دو آدمی تھے ان میں سے پہلے نے کہا۔ ”ہمارا شکار کتہی تیرا اور ہوشیار کیوں نہ ہو وہ ہمارے جال میں پھنسے بغیر نہیں روکے گا۔ آخر اسے نعرے شکار کر لیا.....؟“

”وہ ایک حسین اور پُرکشش عورت ہے اس کے جال میں اچھے اچھے آجاتے ہیں۔“ اس آدمی نے قہقہہ لگایا۔

”کیوں نہ تم..... اس جھوپڑی کو چپک کر کے دائیں طرف چلو میں بائیں طرف چلتا ہوں وہ یقیناً گاؤں میں داخل ہو چکا ہو گا۔“

”کینن ایسا تو نہیں کہ وہ اس سمت تیرنے کے بجائے دوسری سمت تیر کے سامنے

بوڑھے نے دھمکی دی۔

”اگر تم لوگ مجھے پناہ دو تو میں تمہیں اس کے عوض رقم دوں گا۔“ میرے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”رقم.....؟“ اس بوڑھے نے پہلے عورت کی طرف حیرت اور خوشی سے دیکھا پھر مجھ سے بولا۔ ”کتنی رقم دو گے؟“

”دو سو ٹاکا.....“ میں نے بوڑھے کی آنکھوں میں لالچ کی چمک دیکھی تو اوپر کی جیب سے وہ رقم نکالی جو بد معاش کی تھی اس میں سے سو سو ٹاکا کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”یہ رکھ لو.....“

وہ میرے ہاتھ سے رقم لے کر کسی بچے کی طرح خوش ہو گیا۔ اس نے رقم جیب میں رکھنے کے بعد ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ عورت بھی تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر دھمکی تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی۔ وہ بوڑھا صراحتاً آج میرے لیے ہی بولا۔ ”آج آؤ..... آج آؤ بڑے صاحب جی..... جلدی سے اندر آ جاؤ۔“

یہ دولت کا جادو تھا جس نے باپ بنی کو بجلی کی بجی تیزی کے ساتھ متاثر کیا تھا اور وہ برف کی طرح کھل گئے تھے۔ ان کے لب و لہجے میں نرمی اور زبان میں ساری دنیا کی محاسن آگئی تھی ان کا رویہ میرے ساتھ ایسا تھا جیسے میں اس گھر کا کوئی فرد ہوں۔ وہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔

”زقہ بیٹی!“ اس نے عورت کو مخاطب کیا۔ ”جلدی سے تین کپ چائے بنا کر لاؤ بڑے صاحب کے لئے جو بچے پیالے میں لے آتا.....“

وہ کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے اندر میرے ہم گم ہو گئی۔ بوڑھے سے میں نے پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام تزد رو ہے.....“ اس نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو اپنے کپڑے دوں بڑے صاحب جی اپنے کپڑے سو کھنے تک انہیں پن رکھیں۔“

میرے ہائی بھرے پر اس نے کمرے میں بندھی سی پر لٹکتے ہوئے بہت سارے کپڑوں میں سے ایک لٹکی اور قبض نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے کپڑے بدلنے ہوئے اس کے کمرے کو دیکھا۔ ایک غریب آدمی کا گھر تھا۔ اس کے گھر سے اس کی غربت ظاہر تھی۔ اس کے کپڑے بھی بے حد معمولی تھے۔ اس کی بیٹی نے جو ساڑھی پن رکھی تھی

دروازہ کھلا تو میری نظروں کے سامنے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر سفید نشی، اڑھی تھی۔ وہ دہلا چلا، کمزور اور لاغر سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی اور اس پر نشے کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

اس کے پیچھے ایک جوان عورت کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چراغ تھا جس کی روشنی میں ان دونوں کی دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت میں بائیں برس کی ہوگی۔ اس کی رنگت گہری سانولی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نیند کا غلبہ تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی اور اس کی آنکھوں سے ایک انجانا خوف جھانک رہا تھا۔

”آپ کون ہیں بھائی.....؟“ اس بوڑھے نے اپنا سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”میں ایک میٹھے گھریوں اور رات آپ کے ہاں گزارنا چاہتا ہوں۔“

”آپ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہیں۔“ عورت کے چہرے پر استغاب چھا گیا۔ ”آپ کس سے آ رہے ہیں؟ اس وقت یہاں کوئی لالچ نہیں آتی..... اور آپ کے کپڑے جیسے ہوئے کیسے ہیں؟“ وہ ایک ہی سانس میں بول گئی۔

میں نے جواب دینے سے پہلے پلٹ کر اندر میرے چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ ”اندہر آنے دیں تو ہاتھ..... میری جان کو خطرہ ہے۔ مجھے آپ لوگ اپنے گھر میں پناہ دیں تو میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی میں بھولوں گا۔“

”جان خطرے میں ہے.....؟“ بوڑھے نے چونک کر دہرایا اور اپنی گردن گھما کر عورت کی طرف دیکھا عورت کی آنکھوں نے غیر محسوس انداز سے نفی میں جواب دیا۔ وہ بوڑھا میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”نہ باا..... معلوم نہیں کیا پتھر ہے۔ ہمیں معاف کرو۔“

وہ بدحواس سا ہو کر دروازہ بند کرنے لگا تو میں نے دروازے میں جلدی سے اپنی ٹانگ اڑادی۔ ”میری بات تو سنو صرف ایک منٹ پناہ چاہتا۔“

”ہم ایک گھنٹے کے لئے بھی پناہ نہیں دے سکتے۔ معلوم نہیں تم کون ہو؟ شاید ہندوستانی جاسوس ہو۔“ بوڑھا حد درجہ خائف ہو رہا تھا۔

”میں جاسوس نہیں ہوں بلکہ ایک مصیبت زدہ ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اندر آنے دو.....“

”اگر تم نہیں گئے تو ہم جینا چلا شروع کر دیں گے۔ سارا گاؤں جمع ہو جائے گا۔“

اس میں 'میں نے کئی جگہ پوند لگے دیکھے تھے۔

"آپ کیا کام کرتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا وہ چوکی پر خاموش بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں مزدور آدمی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "پان کے باغ کا ایک ٹھیکیدار ہے اس کے پاس یومیہ اجرت پر کام کرتا ہوں۔"

"کتنی اجرت ملتی ہے.....؟"

"پانچ ٹاکا....." اس نے بتایا۔ "کسی کسی دن کام نہیں ہوتا ہے تو کچھ نہیں ملتا۔"

"پانچ ٹاکا میں گزرا ہوا جاتی ہے.....؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آج کل نیشنل تو بڑی منگائی ہے۔"

"ہو تو جاتی ہے بڑے صاحب!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "گزارا کر رہا ہوں۔"

ہے۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان جانے کا سوچ رہا ہوں۔"

"وہ کس لئے.....؟"

"ناہ ہے کہ وہاں مزدوری اور کام کاج کرنے کے بہت اچھے پے ملتے ہیں۔ بلکہ دییش کے سینکڑوں لوگ روزانہ اُدھر جا رہے ہیں۔"

"بھرتہ مجھے کیوں نہیں.....؟" یہ سچ ہے کہ وہاں ہزاروں بنگالی مرد اور عورتیں مزدوری کر کے اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"وہاں جانے کے لئے دو تین ہزار ٹاکا چاہئے صاحب جی! میرے پاس تو تین سو ٹاکا بھی نہیں۔"

"یہ مکان سچ کر چلے جاؤ....." میں نے اسے مشورہ دیا۔ "اس کے چار پانچ ہزار ٹاکا تو مل جائیں گے۔"

"یہ مکان میرے بڑے بھائی کا ہے۔" وہ بولا۔ "گاؤں میں مکان بہت کم خریدتے ہیں اور پھر آج کل ہر آدمی مکان سچ کر پاکستان جانا چاہتا ہے اس لئے مکان خریدنے والا نہیں ملتا البتہ مکان بیچنے والے بہت ہیں۔"

اس کی قبض چھوٹی تھی میرے جسم بھی ہو گئی تھی مگر میں نے کسی نہ کسی طرح پھرتی۔ پھر اس نے مجھے ایک پرانا ٹوٹی کپل دیا جس میں سوراخ اور بہت سارے پوند بھی لگے تھے۔ میں نے کپل جسم پر ڈال لیا اور چوکی پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس وقت

مجھے چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔

رقیقہ تھوڑا دیر کے بعد اسی کے پالوں میں بھاپ اڈائی ہوئی چائے لے کر آگئی۔ یہ چائے اس نے ایک رکالی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں جو بڑا پالہ تھا وہ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ چھوٹے پالے باپ بیٹی نے لے لئے۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ چائے بہت اچھی تھی۔ گڑنی مٹھاس تھی اس میں۔ پہلے گھونٹ سے میرے سارے بدن میں حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ میں تو ناکائی سی محسوس کرنے لگا۔

جب میں چائے پی چکا تو نذر نے مجھ سے کہا۔ "بڑے صاحب جی! آپ اپنے کپڑے دے دیں تاکہ رقیقہ انیس منٹ میں لے جا کر رسی پر ڈال دے۔ صبح تک آپ کے کپڑے سوکھ جائیں گے۔"

میں اپنے کپڑے کپڑوں کی جھینپ خالی کرنے لگا۔ ان دونوں نے میرا ریا اور اور چاقو دیکھا تو ان کے چہرے ایک لمحے کے لئے قہقہے ہو گئے۔ میں نے بڑے رومال اور چابیاں نکال لیں۔ میں نے بڑے میں سے نوٹ نکال کر دیکھے تو وہ کپڑے نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے کہ میرا بڑہ چری تھا اور میں نے پگ لگا رکھی تھی۔ میں نے کپڑے کو دے دیئے۔

رقیقہ کپڑے کپڑے منٹ میں پھیلا کر لائی اور اس چوکی پر میرے لئے بستہ کر دی گئی۔

نذر کو مختصر طور پر اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بتایا۔ میں نے دانستہ اسے ان دو بد معاشوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا جن میں ایک تو میری تلاش میں گاؤں کے اندر چلا گیا تھا۔ دوسرا جسے میں نے بے ہوش کر کے اس کی ٹھیکیں کس کر بھونپڑی کے عقب

دالی بھاڑوں میں ڈال آیا تھا۔

میں نے اس سے پراسرار جزیرے 'اس آدم خور' اسٹیروں اور لانچوں سے پراسرار طور پر غائب ہونے والے شکاریوں اور مسافروں کے بارے میں پوچھا۔ اسے صرف اتنا بتا

تھا کہ اسٹیروں اور لانچوں سے دقیقہ سافرا غائب ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں مرد

لڑکیاں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں اس نے بتایا کہ ان خبروں سے گاؤں میں خوف و ہراس پایا جاتا ہے اور لوگ دن ڈوبنے کے بعد اکیلے گھر سے نہیں نکلتے۔ لانچ سے رات کے وقت

کوئی یہاں آتا بھی نہیں ہے۔

رقیقہ نے بستہ لگا دیا تھا۔ بستہ میلا کچلا تھا مگر نرم اور بے حد گرم بھی تھا محسوس کی وجہ سے مجھے نیند بھی آ رہی تھی میں نے اپنا بڑہ، پٹیل نارنج، چاقو اور ریا اور دیکھنے کے نیچے رکھ لیا۔ میں بستہ پر لیٹا تو باپ بیٹی چراغ لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میرے کمرے کا

دروازہ بھٹردیا۔ کرے میں اندھرا چھا گیا۔

میں بیدار ہوا تو سر بھاری ہو رہا تھا اور مجھ پر نئے کی سی کیفیت طاری تھی میں سر جھٹک کر اٹھ بیٹھا صبح ہو چکی تھی اور کرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دن خاصا نکل آیا تھا۔ میں نے کرے میں ایک عجیب اور بڑا سر اسرار خاموشی محسوس کی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے گھر میں میرے سوا کوئی نہ ہو۔ میں نے بستر سے نکل کر تمام کمرے باورچی خانہ، صحن و غسل خانہ بھی دیکھ لیا ان دونوں کا نام و نشان نہ تھا۔ صحن میں رہلی پر میرے کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور وہ سوکھ چکے تھے۔ میں اپنے کپڑے کرے میں لے آیا، انہیں پستے ہوئے حیران تھا کہ یہ دونوں کہاں گئے؟

میں نے نکلے بنایا تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ میرا بڑا عائب تھا جس میں چار ہزار کی رقم موجود تھی۔ چاقو، چابیوں اور دیو اور کواہوں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ میری رقم چوری کر کے فرار ہو گئے تھے تاکہ پاکستان جا سکیں۔ غربت و افلاس نے انہیں چوری کرنے پر اکسایا تھا۔ ورنہ وہ ایسے نہ لگتے تھے۔ میرا سر بھاری اس لئے ہو رہا تھا کہ میری چائے میں نشہ ملا دیا گیا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا اس بات کی امید تھی کہ بد معاش رات میری تلاش میں ناکام ہو کر جا چکے ہوں گے۔ میں یہاں سے گزرتی ہوئی کسی بھی لالچ سے نکل سکتا تھا۔ دن میں کسی خطرے کی بات نہ تھی دن کا سفر میرے لئے زیادہ بہتر تھا۔ دن میں لاغیوں اور اسٹیمر یہاں سے گزرتے ہوں گے۔ سفر کے اخراجات کے لئے میرے پاس گھڑی تھی۔ وہ میری دست گھڑی جلدی میں اتارنا بھول گئے تھے یا ان کی اس پر نظر نہ پڑی ہوگی۔

میں تھوڑی دیر کے بعد عقبی راستے سے باہر آیا۔ یہ راستہ بھائیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ندی کے کنارے کی طرف جاتا تھا۔ باہر بھی گمراستا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ ندی کے کنارے دو درو در تک کسی کا پتا نہیں تھا۔ میں بھائیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ندی کی طرف جانے لگا تو مجھے ایک جگہ پر نشان نظر آئے۔ یہ وہ نشان تھے جو کسی آدمی کو کھیت کر لے جانے کے تھے اور بھائیوں کے پاس جا کر ختم ہو گئے تھے۔ یہاں بوٹوں کے بھی نشان تھے۔

میں نے بھائیوں کے پاس جا کر جھانکنا ہاں اس بد معاش کا پتا نہ تھا۔ بڑی حیران کن بات تھی کہ وہ بد معاش کہاں اور کیسے چلا گیا۔ رات کے وقت اس کا پتا چلانا آسان نہیں تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کر جا بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ میں نے اس کی خلیں

خوب کس کر باندھی تھیں۔ اس بات کا امکان تھا کہ میں نے غلت میں شاید ٹھیک سے گرہ نہ لگائی ہو۔

مجھے اس بد معاش سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں یہاں سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا اس لئے تیزی کے ساتھ ندی کے کنارے کی طرف بڑھ گیا۔ ندی کے کنارے پر پہنچا تو دو در تک کسی کا نام و نشان نہ تھا البتہ نصف میل پر گھاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ گھاٹ پر بھی کوئی نہیں تھا۔

یہ بہت بڑی ندی تھی اور بل کھاتی ہوئی ایک گاؤں کے پاس سے گھوم گئی تھی۔ ندی کے اس پار ایک گاؤں تھا۔ وہاں کنارے پر لڑکیاں اور عورتیں برتن اور کپڑے دھو رہی تھیں اور پانی میں کھڑے ہو کر نہا رہی تھیں۔ چھوٹے بڑے بھی نہا رہے تھے۔ میں نے ایک لالچ کو آتے دیکھا جو گاؤں کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی۔ یہ کارگرو لالچ تھی۔ اس کے عرشے پر بھری بوئیاں اور کچھ سامان رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے لالچ اُدھر لائے کو کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد لالچ کنارے آگئی۔ عرشہ پر جو دو آدمی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ”آپ کو کہاں جانا ہے؟ ہم کھانا جارہے ہیں۔“

”کھانا جانا ہے.....“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے آپ اوپر آجائیں۔“ انہوں نے ایک لبا تختہ اٹھا کر ریگ کا دروازہ کھولا۔ اس تختے کو نیچے اتارا۔ اس کا ایک سر ریگ کے پاس فرش پر رکھا اور دوسرا کنگلی پر ٹکا دیا۔ میں تختے کے بغیر لالچ پر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ میرے اور لالچ کے درمیان پانی حامل تھا۔ لالچ گھاٹ پر ہوئی تو مجھے تختے سے اوپر جانے کی ضرورت نہ پڑی اور پھر لالچ کا عرشہ پانی کی سطح سے اتنا اونچا تھا کہ میں پانی میں جا کر بھی ریگ کو پکڑ نہیں سکتا تھا۔ میں تختے پر سے دو ریگ کے پاس پہنچا تو ایک آدمی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے عرشے پر بٹھائی لیا۔

میرے عرشے پر قدم رکھتے ہی ان دونوں نے مل کر تختے کو اوپر کھینچ لیا اور اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر لالچ چل پڑی ان میں سے ایک شخص نے زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نیچے جا کر کیبن میں بیٹھ جائیں، آرام کریں، اس میں بہتر بھی ہے۔“

میں نے کاک پٹ کی طرف دیکھا اس میں ایک موٹا اور بھدرا سا آدمی تھا جس کے

چہرے پر کالے رنگ کی عینک لگی تھی وہ وہوبیل کے پاس کھڑا اسے حرکت دے رہا تھا۔ میں زینے کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی سی میز تھی جس میں پانچ تختے لگے تھے میں نے تیسرے تختے پر قدم رکھا تھا کہ سامنے والے کبین کا دروازہ کھلا اس میں سے تین آدمی میرے استقبال کے لئے باہر آئے میں نمک گیا۔

وہ تینوں اپنی وضع قطع اور چہرے کے دس نمبر دی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خفاست سفاکی اور بے رحمی تھی۔ ان کی آنکھوں سے استہزائی پن جھانک رہا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں ایک کٹا چاقو تھا جس کا پھل خوفناک تھا اور وہ چمک رہا تھا۔ باقی دو جو تھے ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ وہ زینے سے دو دم پر کھڑے ہو گئے اس کیمین میں سے ایک اور بد معاشرہ نمودار ہوا جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا یہ وہی پہچان تھا جسے میں نے زخمی کر کے بھاریوں میں ڈال دیا تھا۔ وہ مسخّر سے بولا۔ ”خوش آمدید مسز ملرا را آخر تم ہمارے حال میں پھنسی گئے تھے نا.....؟“

”ہاں.....“ میں نے سر ہلا کر اعتراف کیا اور غیر محسوس انداز سے سب سے اوپر سے نیچے والی میز پر ہنسنے لگا۔ ”تم لوگ جیت گئے میں ہار گیا.....“ مگر میری یہ شکست عارضی ہے۔ آخر میں فتح میری ہی ہوگی.....“

”اچھا.....“ اس نے ایک تقمہ لگایا۔ ”ہاتھ کٹن کو آرسی کیا..... وہ بھی دیکھ لیں گے۔ آج تک ہمارے جال میں آکر کوئی بچ کر نکل نہ سکا۔“

”میں تمہارے اس غرور کے بت کو توڑ کے پاش پاش کر دوں گا۔ تم مجھے آسانی سے شکار نہ کر سکو گے.....“ میں نے بڑے بڑ سکون لیے میں کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ تمہارا واسطہ کس سے بڑا ہے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم سب سے خطرناک عسکار ثابت ہوئے ہو۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”کل رات تم نے میرا سر پھاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ کہو کہ مجھے ہوش آگیا اور میری کراہی میرے دوست نے سن لیں۔“

”آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو اور میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ ہمارے پاس کا حکم ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”شرافت سے میری رقم اور میری چیزیں واپس کر دو۔.....“

”میرے پاس سوائے تمہارے چاقو کے کوئی اور چیز نہیں ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”رات میں نے جس کے ہاں قیام کیا تھا اس نے اور اس کی بیٹی نے میری جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ وہ میرے بھی تین ہزار ناکالے کر رات کو بھاگ گئے۔“

”تم جھوٹ بول کر میری رقم اور چیزیں بڑپ نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھی تمہارے چہرے کا جغرافیہ بگاڑیں گے.....“

”اچھا تو میری تلاشی لے لو.....“ میں نے سیڑھی پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔

”اے اوشامو!“ اس نے پستول لئے کھڑے شخص کے شانے کو ہلایا۔ ”تو ذرا اس کی تلاشی تو لیتا۔ دیکھنا ہے کہ یہ کتنا سچ بول رہا ہے۔ ہمیں بے وقوف سمجھ رہا ہے۔“

وہ اپنی بیب میں پھنسل رہا تھا۔ دیکھ کر میری طرف بڑھا۔ میں اسی موقع کی تو تک میں تھا۔ میرے پیچھے زینے پر کونکی نہیں تھا۔ اس میں وقت سفاری سوٹ میں بیوس تھا۔ اس نے میری دونوں جینیں تھپ تھپائیں۔ اس نے ایک بیب میں ریو اور لمبوس کر کے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا تاکہ کھن کھن کر ریو اور نکال سکے۔ میں بے حس و حرکت کھڑا رہ کر اسے کارروائی کرنے دی۔

وہ میرے غیر متوقع تعاون کی وجہ سے ذرا سے غافل ہو گئے تھے۔ وہ میری جیب کا ٹٹن کھولنے لگا تو میں نے اس کے پیٹ میں پوری قوت سے ایک لات رسید کی وہ الٹ کر پئے چنے سٹھائیوں پر جا گر ا۔ وہ بری طرح جھج پڑا تھا۔

میں دوسرے لئے عرش پر تھا۔ عرش پر وہ دونوں بد معاش ریٹک کے سارے کھڑے بیڑی بی رہے تھے اور کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے عرش پر قدم رکھا سچے سے آوازیں میرا تعاقب کرنے لگیں۔ ”پکڑو..... پکڑو..... جانے نہ دے۔“

وہ دونوں آواز سننے ہی چو گئے، انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ میری طرف لپکے۔ نیچے سے بھی کوئی اوپر آ رہا تھا میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور نہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ دونوں اتفاق سے خیر مسل تھے۔ میں پلٹ کر دوسری سمت تیزی سے دوڑا۔ وہ دونوں میرے پیچھے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ میں ریگ کے پاس پہنچا تھا کہ یکے بعد دیگرے بڑھ پر دو فائر ہوئے۔ ایک گولی تو میرے دائیں ہیرے کے پاس سے سنسنائی ہوئی گزری تو دوسری میرے سر پر سے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں میں سے کوئی مجھے پکڑا تا میں نے ریگ بڑھ کر مانی میں جھانک لگا دی۔ ان

دونوں نے بھی میرے پیچھے پیچھے چھلانگ لگادی۔ چونکہ میں ماہر جیڑاک تھا اس لئے اور گھرائی میں جا کر تیرتا ہوا پانی کی سطح پر آیا تو میں لالچ کی دوسری طرف اور عقبی حصے پر تھا۔ پانی میں دو اور آدمی شاید کود پڑے تھے اور وہ چاروں بیچ چلا رہے تھے۔ اس طرف کوئی نہیں تھا ایک رسی ٹنگ رہی تھی جس کا سر پانی میں ڈوب رہا تھا۔ میں نے کسی کے اس سمت آنے کی آواز سنی تو وہ بڑی آہستگی سے پانی کے اندر چلا گیا اور رسی کا سرا پکڑ لیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے نکل گئے۔ پھر میں پانی کی سطح پر ابھرا تھا کہ میرے سر پر کسی سخت چیز کی ضرب لگی تو میرا سر پکڑا یا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر میں تارکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆-----☆-----☆

میں شاید دو ایک دن بے ہوش رہا مجھے شاید بے ہوشی کا انکشاف دے دیا گیا تھا اس لئے کہ جب میں ہوش میں آیا تو میں لالچ کے کین میں نہیں بلکہ ایک ہسپتال جیسے کمرے اور ایک بنگ کے صاف ستھرے بستر پر تھا۔ میرے بدن پر مریضوں کا لباس تھا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور نشہ سا چھایا ہوا تھا یہ نئے کے انکشاف کا اثر تھا جو ابھی پوری طرح اترا نہیں تھا۔

میں نے اپنا سر ہینک کے سامنے کی طرف دیکھا جہاں کھڑکی تھی اس کھڑکی میں لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس پر ایک مفید پردہ پڑا تھا۔ پردے میں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ کمرے کے اندر ادراہا ہر گھبراہٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی دیوانی بھی برستی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ یہ عمارت کسی گاؤں میں واقع ہے۔ دوسرے لئے اس خیال کی نفی ہو گئی۔ اس لئے کہ چھت پر کھسا اور ایک ٹیوب لائٹ لگی ہوئی تھی۔ یہاں ہزاروں گاؤں اور علاقے آج بھی ایسے تھے جہاں بجلی نہیں پہنچی تھی۔ پتھر بھی نہیں ملتی تھی اس لئے کہ ہر سال جو طوفان آتے تھے وہ مواصلات کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیتے تھے۔

میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سارے بدن میں کمزوری سی محسوس ہوئی۔ میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد سوچا کہ اب مجھے دیکھنا چاہئے کہ میں کہاں ہوں یہ عمارت ہسپتال کی ہے یا کوئی مکان وغیرہ ہے۔ میں بستر سے اترنے والا تھا کہ کمرے کے باہر چاچا کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شاید اس کمرے کی طرف آ رہا تھا میں نے فوراً ہی بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمبے بعد دروازہ کھلا۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ نکمہ پر گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا کمرے میں ایک جوان نرس چھوٹی سی نرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی وہ اندر داخل ہو کر

”کیا یہ انجشن بھی بے ہوشی کا ہے؟“ میں نے فیض کی آستین نیچے اتارتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی نہیں.....“ وہ مسکرائی۔ ”یہ طاقت کا انجشن ہے اب آپ غسل خانے میں جا کر نمائیں۔ شیو کر لیں اور تیار ہو جائیں۔ میں اتنی دیر میں آپ کے لئے ناشتہ تیار کر کے لے آئی ہوں۔“

”شیو سالمان تو میرے پاس نہیں ہے؟ اور پھر مجھے ایک جوڑا لباس کا بھی چاہئے۔“ میں نے ہلکے سے اترتے ہوئے کہا۔

”یہ سب کچھ آپ کو غسل خانے میں مل جائے گا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو من دبا کر مجھے بلائیں۔“

وہ دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئی۔ میں چند لمحوں کے بعد دروازے کی طرف بڑھا تاکہ دروازہ کھول کر تو دیکھوں کہ یہ کوئی پرائیویٹ ہسپتال ہے یا مکان..... دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے غیر محسوس انداز سے اس پر گنگے پنڈل کو گھمایا۔ پوری طرح حرکت دینے کے بعد اسے اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ وہ بند تھا اس نے دروازہ کس طرح بند کیا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ چالی گھنٹے کی آواز بھی نہیں آئی۔ شاید باہر سے اس دروازے کو بند کرنے کا کوئی طریقہ تھا۔ میں نے دوایک مرتبہ دروازے کو اپنی طرف کھینچا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے چالی کے سوراخ میں سے باہر جھانکا تو میرے بدن پر سسکی کی لہر دوڑ گئی ایک لال اور خوشنکاح آنکھ سوراخ میں سے جھانک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

دروازہ نہ کھلنے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی اور نرس نے میرے دوایک سوالوں کا جواب جو نہیں دیا اس کی وجہ بھی نہیں غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ غسل خانہ خاصا بڑا تھا اس میں ٹوائلٹ بھی تھا ایک طرف میگزین سفید تولیہ اور ایک دھلا سفید جوڑا لنگا تھا جہاں میں لگا تھا ہاں دیوار میں ایک آئینہ بھی تھا اور سینڈ میں شیوگ کریم ’ریز ربلینڈ‘ کا ایک بیگٹ نمائے کا سا بن اور آفرشیو لوشن بھی تھا۔ مل جل کر مہانی آ رہا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میری داڑھی کسی بچوں کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور میرا حلیہ کسی فقیر کی طرح ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے شیو کیا تو میری اصل صورت نکل آئی اور میں نے اپنے سارے بدن میں جستی محسوس کی۔ جب میں نما کر اور کپڑے بدل کر کمرے میں آیا تو تازہ و تھوڑا دیر مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ کبھی میں نے

دروازہ بند کر رہی تھی اس لئے میں اس کی شکل دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے میری طرف گھومی تو میں نے اسے دیکھا اور ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔

وہ میں بائیں برس کی جوان لڑکی تھی۔ سانولی رنگت کی پُرکشش لڑکی چھریر اور متناسب بدن قدر دیمانہ تھا۔ وہ ٹرے لئے میری طرف بڑھی تو اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ سفید لباس میں وہ دست اچھی لگ رہی تھی اس نے میرے قریب آ کر ٹرے ساؤنڈ ٹیبل پر رکھ دی اور مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”صبح بخیر..... مسٹر سالار!“

”صبح بخیر.....“ میں نے جواب دیا۔ اس کی آواز بھی خوبصورت تھی میں نے ٹرے کی طرف دیکھا اس میں روٹی کے تین چار پیچھے اور ایک سرخ رنگی تھی۔ وہ مجھے انجشن لگانے آئی تھی۔ ”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”ہیرا نام سرتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں نرس ہوں۔“

”کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ میں کہاں ہوں؟ یہ ہسپتال ہے یا گھر.....؟“

”یہ ہسپتال ہے اور آپ ہسپتال کے کمرے میں ہیں۔“ وہ ٹرے میں سے روٹی کا پیچھا اور سرخ اٹھا لی ہوئی بولی۔

”یہ کون سا ہسپتال ہے اور کس جگہ پر واقع ہے۔“ میں نے اپنی فیض کی آستین بازو تک چڑھا تے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سرخ کی سوئی سے پیچھے کو گلیا کرنے کے بعد میرے قریب آئی۔ اس نے پیچھے کو میرے بازو پر ملا اور پھر اس جگہ سوئی داخل کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”آئی ایم ساری مسٹر سالار میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی.....“

”کیوں؟“ میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ کو منع کیا گیا ہے؟“

”آپ بہت سمجھدار ہیں مسٹر سالار!“ اس نے دوسرے لمحے سرخ میرے بازو سے نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا آپ یہ تو جانتی ہیں کہ میں یہاں کب سے اور کتنے دنوں سے بے ہوش ہوں۔“

”جی.....“ اس نے روٹی کے اس پیچھے سے میرے بازو کو ملا اور ٹرے میں سرخ رکھ کر اسے اٹھا لیا۔ ”تین دن پہلے آئے تھے اور اس روز سے آپ کو مسلسل بے ہوشی کے انجشن دے کر بے ہوش رکھا گیا۔“

"سینڈوچ آپ کے لئے اور کافی میرے لئے ہے۔" اس کے ہونٹوں پر دلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ میر نہیں ہوئے ہوں گے۔"

"وہ کیسے.....؟" میں نے سینڈوچ کی پلیٹ ٹرے میں سے اٹھاتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک صحت مند شکاری جو تین چار دن سے سخت بھوکا ہو اس کے لئے یہ ناشتہ کافی کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں شکاری نہیں بلکہ شکار ہوں۔" میں نے کافی ٹانگ اٹھا کر اس کا گھونٹ حلق سے اتارا۔ کافی بہت اچھی تھی اور مزہ دے رہی تھی۔ وہ بھی کافی پینے لگی۔ میں نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ مجھے شکار کس لئے کیا گیا ہے؟"

اس نے جواب دینے سے پہلے دروازے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ "میں کچھ نہیں جانتی۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے میرے سوال کا جواب دینے میں کون سی بات مانع ہے۔ میں نے اس کی طرف سینڈوچ کی پلیٹ پڑھائی۔ اس نے شکر یہ کہہ کر لینے سے انکار کیا۔ پھر میرے اصرار پر ایک پس اٹھایا۔ میں اس سے سوال پوچھنے کے خیال سے سینڈوچ کی پلیٹ پر جبک گیا۔ "لیا اس جیل خانے میں اور بھی قیدی ہیں.....؟"

"جیل خانہ ہے تو اور بھی قیدی ہوں گے مگر آپ یہاں سے فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ ایسے سوالات پوچھنے کی کوشش نہ کریں جو یہاں سے متعلق ہوں۔ میں نے آپ کی ایک بات کا بھی جواب دے دیا تو پھر آپ کی خدمت پر کسی مرد کو لگا دیا جائے گا۔"

اس کی بات سن کر میں نے اس سے مزید سوالات پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا میری وجہ سے غریب کسی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ میں اس سے آگے چل کر قاعدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ میرے فرار ہونے میں بڑی مدد کر سکتی تھی لیکن اتنی جلدی بھی نہیں۔ اس نے فرار نہ ہونے کے لئے جو کچھ کہا تھا اس میں میرے لئے ایک طرح سے اشارہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ برتن لے کر چلی گئی تو میں نے کھڑکی کے پاس جا کر باہر بھاگنا۔ مانتے ایک عمارت کا عجیب حصہ نظر آ رہا تھا۔ ادھر کھلی جگہ اور بھاریاں تھیں۔ دائیں اور بائیں بھی بھاریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ مگر اس کو ساٹھاری تھا میں چند لمحوں تک کھڑا رہا

ایسی بھوک محسوس نہیں کی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ سریتا ایک بڑی سی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ دروازہ جس شخص نے کھولا تھا اس پر میری نظر پڑی۔ وہ ایک بد صورت اور خوفناک چہرے کا شخص تھا۔ اس کی کمر میں ایک بچی بندھی تھی اس میں پتول اور گولیاں نظر آ رہی تھیں۔ سریتا کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے سریتا سے کہا۔ "بڑا سخت پہرہ ہے۔ میں جیسے مریض نہیں قیدی ہوں۔"

سریتا کے ہونٹوں پر مسی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ "جی ہاں..... آپ اپنے آپ کو قیدی سمجھیں معزز بھمان نہیں۔"

اس نے ٹرے بلا بستر پر رکھا تو میں نے ناشتہ کا جائزہ لیا۔ بڑا بڑا ٹکلف ناشتہ تھا لیکن چائے نہیں تھی۔

"کیا ناشتہ بغیر چائے کے ہو گا.....؟" میں نے سلاکس اور چھری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں چائے اس لئے نہیں لائی کہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" اس نے مسکرا کے جواب دیا۔ "آپ کافی نہیں گئے یا چائے؟"

"میں نے سلاکس پر کھین لگاتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو قیدی کو بڑا شاندار ناشتہ دیا جاتا ہے۔"

"اچھا میں آپ کے لئے کافی بنا کر لے آتی ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی ہوئی۔ "آپ کو کیونکہ خاص قیدی ہیں اس لئے آپ کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔....."

میں چونکہ تین چار دن سے بھوکا پکا سا تھا اور ریت میں جو بے دوڑ رہے تھے اس لئے میں ناشتے پر کسی ندر سے بچنے کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر میں نے ناشتہ ایک طرح سے بڑپ کر لیا۔ بڑے پوری طرح صاف ہو چکی تھی۔ صرف جام جیلی کے علاوہ کوئی اور چیز بچی نہیں تھی اس قدر بڑا ٹکلف ناشتہ بضم کرنے کے باوجود میری بھوک پوری طرح مٹی نہیں تھی۔ کچھ اور کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔ سریتا چندہ میں منٹ کے بعد دو کپ گرم گرم کافی اور سینڈوچ لے آئی تو میرا دل خوش ہو گیا۔

"یہ سینڈوچ کس کے لئے.....؟" میں نے پوچھا۔ "دو کپ کافی کیا میرے لئے؟"

یہ جگہ شر اور کسی گاؤں میں نہیں تھی۔ کسی جزیرے پر آباد معلوم ہوئی تھی۔ پھر میں نے ایک لالچ کے سازن کی آواز سنی جو بہت دور سے آ رہی تھی۔ اب یہ بات علم میں آگئی تھی کہ یہ گاؤں ہے اور ندی کے کنارے یا کسی دریا کے پاس واقع ہے۔

میرا ایک دن تو اس طرح گزر گیا۔ سہرے کے سو اونی اور مجھ سے بات کرنے میری مزاج پر ہی کے لئے نہیں آیا۔ وہ میرے لئے کھانا چائے اور دُررات کا کھانا لے کر آئی رہی۔ دو پہر اور دُررات کا کھانا بھی بہت پر تکلف اور شاندار تھا۔ نہ بڑا اور نہ دُررات کا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے یہاں کیوں اور کس لئے لایا گیا ہے۔ آخر کوئی آدمی آکر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟ مجھے کس مقصد کے لئے یہاں قید کیا گیا ہے۔

میرے پہلے چائے کھانا اور ناشتہ سہرے کا وہاں اپنے ہاتھوں سے پکا کر لاتی تھی۔ صبح وہ میرے لئے ناشتہ لے کر آئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ برتن لے جاتے وقت بولی۔ ”مسٹر سالار! تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر اور میاں کے انچارج آپ کا معائنہ کرنے اور آپ سے ملنے کے لئے آئیں گے۔“

”کس بات کا معائنہ.....؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ میں انچارج سے بات کرنا پسند کروں گا۔“

”یہ بات تو آپ کو ڈاکٹر ہی بتائیں گے۔“ وہ بولی اور کمر سے نکل گئی۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا تو سب سے پہلے سریتا داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اس کے پیچھے ایک شخص پتلون قمیض اور بلیں میں لباس تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں تاریک شیشوں کی عینک سے چھپا رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر فریج کٹ داغی تھی اس کے چہرے سے جو سفائی نمایاں تھی اس سے وہ درندہ صفت شخص لگ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ دی خون آشام بھیڑیا ہے جو انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ آدم خور ہے اس کے پیچھے پیچھے سفید ان میں جو شخص داخل ہوا وہ ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے ایک مسلح شخص تھا وہ کسی پیشہ ور قاتل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے کینہ توڑ نگاہوں سے گھور رہا تھا اس کے ہاتھ میں بید ترین شین گن تھی وہ چونکا اور چونکس تھا میں نے ایک لمبے کے لئے دل میں سوچا کہ کاش یہ شین گن میرے ہاتھ لگ جائے۔

ڈاکٹر کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ یہ ڈاکٹر سرنجی قدرت خدا تھے۔ آکھوں کے ماہر۔ ہنگہ دیش میں ان کے پاسے کا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا اور ان کا شمار دنیا کے چند ہی چلنے ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ آج تک ان کے ہاتھ کا کوئی آپریشن ناکام نہیں ہوا تھا۔ ہنگہ

میں یہ عزت و قدر نگاہوں سے دیکھ جاتے تھے اس لئے کہ غریب پرور تھے۔ غریبوں کی آنکھوں کا مفت آپریشن کرتے تھے۔ وہ دوسرے ڈاکٹروں کی طرح لالچ فطرت کے نہ تھے۔ انسان دوست آدمی تھے۔

وہ میری کتاب کی رومانی میں بھی آئے تھے۔ نجم التہار کے دور کے رشتے داروں میں تھے۔ وہ میرے بڑے قدر دان تھے اور ان کے پاس میری تقریباً تمام کتابیں بھی موجود تھیں۔ انہوں نے ابھی میری طرف دیکھا نہیں تھا وہ مجھے والے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں انہیں یہاں دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ میری جرت بھری نظریں انہی پر مرکوز تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ایک عظیم شخص کا تعلق ایک درندہ صفت انسان سے بھی ہو سکتا ہے۔

جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو وہ بری طرح چونک پڑے۔ انہیں جیسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تجرذہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ان کا یہاں کیا کام.....؟ وہ کس لئے اس ظالم و جابر شخص کے ساتھ ہیں۔ جو انسانیت کی پیشانی پر ایک داغ ہے۔ میں ہلکے سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا تو وہ تیزی کے ساتھ میری طرف بڑھے اور مجھ سے ہٹکر ہو گئے۔

”مسٹر سالار! آپ یہاں.....؟“ وہ حیرت کے لمحے میں بڑے زور سے بولے۔ پھر سرگوشی کی۔ ”ہریت پر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرو۔“

میں نے ان سے الگ ہو کر ان کی آنکھوں میں بھانکنا ان کی اس بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی زبان بھی مجھ سے یہی کہہ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر ہلاکی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس جیسے والے شخص نے ہمارے پاس آکر کہا۔ ”اچھا تو آپ دونوں ایک دوسرے سے ذاتی طور پر بھی واقف ہیں۔ بہت خوب.....؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔“

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک مسلح شخص نے اندر داخل ہو کر مجھے والے سے کہا۔ ”سرا! اس کا ٹیلیفون آیا ہے۔“

”میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔“ اس نے سریتا اور ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ دونوں یہیں غمیریں۔“

وہ کمرے سے نکلا تو اس کے پیچھے پیچھے مسلح شخص بھی چلا گیا۔ کمرے میں ہم تینوں رہ گئے۔ میں نے ڈاکٹر قدرت خدا سے پوچھا۔ ”سرا! آپ یہاں کیسے.....؟ کیا آپ کا ان سے کوئی تعلق ہے؟“

ادب والا بجائے گا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ جو صلہ نہ بارو۔ اس کی ذات پر بھروسہ رکھو۔
”تو کیا آپ کو بھی میاں اغوا کر کے لایا گیا ہے؟“ میں نے حیرت سے سر ہٹا کر پوچھا۔

”آپ میاں کب سے قید ہیں؟“

”جی ہاں.....“ اس نے اپنا سر ہلایا۔ ”کوئی دو مہینے پہلے دس نرسوں کو سینٹ جان ہسپتال کے ہوٹل سے اس خوبصورتی اور منسوب بندی سے اغوا کیا گیا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ان دس نرسوں میں سے میں ایک ہوں۔ دوسرے دس ان ہسپتال سے دو ڈاکٹروں کو بھی اغوا کر کے میاں پہنچا دیا گیا۔ ان میں سے دو نرسوں کو میاں رکھ لیا گیا۔ باقی آٹھ نرسوں اور دو ڈاکٹروں کا کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ ان کا کیا حال ہے؟ وہ زندہ ہیں یا مر گئے؟ میاں صرف دو نرسیں ہیں جو قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہیں۔ ہم دونوں میاں شرمناک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس زندگی سے نجات پانا چاہتی ہیں مگر اس کوشش میں بھی ہم کامیاب نہ ہو سکیں۔ انہوں نے ہمیں ایک سال تک اس شرط پر قید رکھنا منظور کیا ہے کہ ہم ان کا دل بھلائی دیں۔ پھر ایک سال کے بعد ہمیں نہ صرف رہائی ملے گی بلکہ ایک کثیر رقم بھی دی جائے گی۔ اس جھوٹے وعدے پر ہم میاں زندگی گزار رہی ہیں۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔

”پھر بھی تم چاہتی ہو کہ ایک شخص اپنے آپ کو ان دونوں کے حوالے کر دے جن کے نزدیک انسانوں کی کوئی اہمیت نہیں، یہ سفاک دونوں اے سسکا سسکا کر اس طرح مار دیں کہ وہ اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔ کیا ایسا شخص ان کے وحشیانہ مظالم کا نشانہ بننے کے بجائے ان سے مقابلہ نہ کرے۔ صرف اپنی زندگی اور بقا کے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے ان بد نصیبوں کے لئے جو ایسے شخص کی قید میں ہیں جو انسان کے بھیس میں شیطان ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس شیطان سے زندگی کی بیکمانگیں گے تو زندگی کی بیکمانگیں گے؟“ ڈاکٹر قدرت خدا کی سانس پھولنے لگی۔

”نہیک ہے ایک کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔“ سریتا رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں مسٹر سالار کی کامیابی کے لئے دعا کروں گی۔“

”تم زرا کو مشت کر دو اور جان پر کھیل جاؤ تو سالار کے فرار میں آسانی ہو جائے گی۔ پھر اس شیطان سے انسانوں کو نجات مل جائے گی۔“

”میں تو اپنی جان دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔“ وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگی۔

”اب میرے لئے زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی اور نہ جینے کی کوئی انگ رہی ہے۔“

”کیا آپ کے خیال میں ایک ڈاکٹر ایک درندہ صفت شخص یا تنظیم سے کسی قسم کا تعلق رکھ سکتا ہے؟“

”نہیں.....“ میں نے اپنا سر ہلایا۔ ”آپ کو میاں دیکھ کر مجھے دکھ اور حیرت ہوئی ہے۔ میں اناٹک دور کر رہا ہوں۔“

”دو دن پہلے مجھے میری چٹا گنگ کی رہائش گاہ سے ایک ہفتہ کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔“

”وہ بتانے لگے۔“ اس تنظیم کے پاس نے مجھے ایک خاص مقصد کے لئے اغوا کیا ہے۔ اس کا مقصد ایک نیا تجربہ کرنا ہے۔“

”کیسا تجربہ.....؟“ میں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔ ”وہ آنکھوں کے ماہر سے کس قسم کا تجربہ کرانا چاہتا ہے۔“

”پلیز ڈاکٹر.....“ سریتا نے انہیں ٹوکا۔ ”آپ مسٹر سالار کو کچھ نہ بتائیں۔ مسٹر جعفر غصہ ہو جائیں گے۔“

”یہ مسٹر جعفر کون ہے؟“ میں نے سریتا کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہارے پاس کا نام جعفر ہے؟“

”مسٹر جعفر اس علاقے کے انجارج ہیں۔“ سریتا بولی۔ ”ہمارے ساتھ آئے تھے اور اب پاس کا بیٹھن سننے کے لئے مجھے ہیں ان کا نام جعفر ہے۔ وہ بہت سخت مزاج آدمی ہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو وہ انہیں سخت مزاح دیتے ہیں۔“

”دیکھو نرس!“ ڈاکٹر قدرت خدا نے اس سے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ سہرا موقع ہے کہ میں اپنے دوست کو تمام باتیں بتا دوں تاکہ یہ میاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ کیا معلوم اس شخص کی وجہ سے ہمیں اس ظالم کی قید سے نجات مل جائے۔“

”جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی ہو کیا وہاں سے فرار ممکن ہے؟ جہاں قدم قدم پر درندے پہرہ دے رہے ہوں وہاں کوئی صورت کیسے ہو سکتی ہے۔ میاں تو ہر لمحہ موت کا خطرہ ہے۔ نہیں..... ڈاکٹر نہیں..... میاں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ فرار ہونے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

”میں تو خدا کی ذات سے بھی ناامید ہو گئی ہوں۔“

”انسان کو خدا کی ذات سے آخری سانس تک ناامید نہیں ہونا چاہیے۔“ ڈاکٹر قدرت خدا نے نرس کے پاس جا کر اس کا شانہ چھتہ پٹیا۔ ”ہمیں اس حیثیت کی ذات سے

”تم اپنی کوشش جاری رکھنا اور میں دو ایک دن کسی نہ کسی زمانے سے آپریشن ٹالتا رہوں گا۔ ادھر مسٹر سلا ر کوئی منصوبہ بنالیں گے۔“

”کیسا آپریشن.....؟ کس کا آپریشن.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”آپ کا آپریشن.....“ ڈاکٹر قدرت خدا نے جواب دیا۔ ”یہ درندہ مفتخص جس کی صورت میں نے بھی نہیں دیکھی وہ ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ اس تجربے کے لئے اس نے میرا انگوٹھا۔ اس تنظیم کے آدی نے مجھے بتایا کہ ان کا پاس ہر سال کوئی نہ کوئی نیا تجربہ انسانوں پر کرتا ہے۔ خاص کر شکاریوں پر۔ اس کے نزدیک یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔“

”میرا کس چیز کا آپریشن کرنا چاہتا ہے وہ.....؟“ میرا دل دھڑکنے لگا۔

”آنکھوں کا.....“ ڈاکٹر قدرت خدا نے بتایا۔

”آنکھوں کا.....؟ میری آنکھیں تو اچھی جمی جلی ہیں۔ وہ میری آنکھوں کا آپریشن کروا کے کیا کرے گا؟“
 ”وہ آپ کی آنکھیں نکال کر اس کی جگہ شیر کی آنکھیں لگاتا چاہتا ہے۔ شیر کی آنکھوں میں آپ کی آنکھیں.....۔“

”کیا.....؟“ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میرے جسم میں لوبورف کی طرح سر دھونے لگا۔

”وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ایک انسان کو شیر کی آنکھیں مل جائیں تو اسے کیسا لگے گا اور اس میں کیا تبدیلی رونما ہوگی۔ کیا رد عمل ظاہر ہوگا۔ اس طرح سے وہ شیر کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس تجربے کے لئے اس نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔“
 ”یہ تو کوئی بھٹی اور پاگل معلوم ہوتا ہے۔“ میرے حلق میں آواز پھنسنے لگی۔
 ”اس تجربہ سے اسے کیا حاصل ہوگا؟“

”آپ سچ کہتے ہیں۔“ سریتا نے میری تائید کی۔ ”یہ یہاں جو ہسپتال ہے اس میں نت نئے تجربے کئے جاتے ہیں۔“

”کیسے تجربے.....؟“ ڈاکٹر قدرت خدا نے سریتا کی طرف حیرت سے دیکھا۔
 ”کیا یہاں اور بھی ڈاکٹر اور سرجن ہیں؟“

”کوئی ایک تجربہ ہو تو بتاؤں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”بھی تو کسی انسان کا دماغ کسی خوفناک جانور سے بدل دیا جاتا ہے تو کبھی کسی مرد کا دل کسی عورت کے دل سے..... یہاں دو

تین سرجن ہیں جو یہ آپریشن کرتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی یہاں قیدیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔“

”کیا یہ آپریشن کامیاب ثابت ہوئے ہیں.....؟“ ڈاکٹر قدرت خدا کے چہرے پر گہرا استغاب چھا گیا۔

”بہت کم آپریشن کامیاب ہوئے ہیں۔“ سریتا نے بتایا۔ ”ان لوگوں کا آپریشن کرنے کے دو تین دن کے بعد انہیں یہاں سے ایک جزیرے پر لے جایا جاتا ہے۔ اس جزیرے پر ان کا پاس رہتا ہے اور وہ وہیں سے حکومت کرتا ہے۔“

”جزیرہ.....؟“ میں چونکا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ جزیرہ کہاں واقع ہے؟“

”نہیں.....“ سریتا نے سر ہلایا۔ ”میں نے کبھی جاننے اور کسی سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر آپ کو اس جزیرے کا پتا چل بھی گیا تو آپ کیا کریں گے؟“
 ”سنا ہے کہ اس جزیرے پر ہر کوئی بیچ بیچ میں سکسٹنٹ، فٹیلی سے کوئی بیچ گیا تو وہاں نہیں آسکتا۔ اس جزیرے کے بارے میں سنا ہے کہ اس گاؤں سے کہیں خوفناک اور پر اسرار ہے۔ وہ ایک ظلم ہے۔ اس جزیرے پر ایک درندہ مفت انسان کی حکمرانی ہے۔“

”اس جزیرے کا پتا چل جائے تو ایک ہی دن میں نہ صرف اس خبیث سے نجات مل سکتی ہے بلکہ سیکڑوں کو رہائی بھی۔ اس شیطان نے درندگی کی حد کر رکھی ہے۔ وہ نت نئے مظالم کو تجربات کا نام دے کر انسانیت کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔“ میری نس نس میں لہو اٹھنے لگا۔

”کیا اس گاؤں میں ایسا آپریشن تحفظ اور آلات جراثیم ہیں کہ اس قسم کے آپریشن اور تجربات کئے جاسکیں؟“

”سریتا آپریشن تحفیٹ کے بارے میں کچھ کہنے والی تھی کہ کرب کے باہر آداز میں سنائی دیں۔“ جعفر اپنے مسلح گاڑے کے ساتھ اس کمرے کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹر قدرت خدا نے میرے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”مسٹر سلا ر! جتنا جلد ہو سکے آپ یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنائیں۔ خدا آپ کی مدد کرے۔ یہاں سے نجات پانے کے بعد انسانیت کو اس شیطان سے نجات دلانیں۔“

”کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔“ جعفر اپنے مسلح گاڑے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس کا پتا اور رہے رچہ رچہ کسی خیال سے دک رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر قدرت خدا کے پاس

آکھوں کی تبدیلی کا آپریشن ہو گا۔ پھر آپ کو اس چہرے میں اس چہیتے کے ساتھ قید کر دیا جائے گا جو آپ کی آنکھوں کا مالک ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس چہیتے کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟ آپ اسے جبر پھاڑ کر رکھاتے ہیں یا وہ..... ہم اس کی ایک ویڈیو فلم بھی بنائیں گے۔“

”ایک ذلیل اور کمینہ خصلت آدمی اس کے علاوہ سوچ بھی کیا سکتا ہے؟ تم آدمی نہیں درندہ ہو۔“ میں نے سخت لگا ہوں سے گھورا۔

”اگر میرے پاس آپ کے لئے خاص ہدایات نہیں ہوں تو میں آپ کو ابھی مزہ چکھا دیتا۔ ہیرکرافٹ آپ مجھے غصہ نہ دلائیں۔ میرا دماغ گھوم گیا تو میرا آدمی آپ کے چہرے کا غہرائی ایسا تبدیل کر دے گا کہ آپ اپنے آپ کو بھی پہچان نہیں پائیں گے۔“

فضائیں تنہی ہو سکتی دیکھ کر ڈاکٹر قدرت خدا ہم دونوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ ”پلیز! بات مت بولنا۔“ چہرہ جھٹکی طرف گھوم کر بولے۔ ”کیا آپ اپنے ہسپتال کے آپریشن حیطے کے بارے میں کچھ بتا پند فرمائیں گے؟“

”آپ آپریشن حیطے کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“ جھٹکا پنا غصہ فرو کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا آپریشن حیطہ اور آلات جراثیم ایسے ہیں کہ آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن ہو سکے؟“

”آپریشن حیطہ.....؟“ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بھیل گئی۔ ”میرا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے جیسا آپریشن حیطہ اور آلات جراثیم پورے بنگلہ دیش میں تو کیا ہندوستان اور پاکستان میں بھی نہیں ہوں گے۔ سارا سامان خاص طور پر مغربی جرمنی سے منگوا گیا ہے۔ یہ سب کچھ جدید ترین اور نیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔“

”آخر اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر لاکھوں ٹاکا پانی کی طرح کیوں بھایا گیا؟ آخر آپ کا پاس اس سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟“

”یہ میرے پاس کا شوق ہے۔“ وہ بولا۔ ”وہ بھی ایسی سرجن ہیں، کوڑ پڑتی آدمی ہیں، ان کی اپنی مرضی وہ جیسا اور کس طرح چاہیں خرچ کریں..... دولت ہوتی کس لئے ہے؟ خرچ کرنے کے لئے۔ یہ ان کی اپنی دولت ہے وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں ہم کون ٹوکنے اور مشورہ دینے والے۔“

جا کر بولا تو اس کے لمبے میں ایک عجیب سی سرشاری تھی۔ ”میرے پاس کینیڈین آیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ شیر کے بھائے ایک خوفناک قسم کا چیتا ہاتھ لگا ہے۔ وہ حد سے زیادہ خطرناک ہے۔ میرے پاس کا یہ خیال ہے کہ چیتے کی آنکھوں کا آپریشن زیادہ بہتر رہے گا۔ یوں بھی اس کی آنکھیں خوبصورت، تیز اور بے حد پتیلی ہوتی ہیں۔ کیوں.....؟“

”اگر آپ میرا خیال پوچھتے ہیں تو میں یہ کون گا کہ یہ آپریشن نہیں بلکہ ایک معصوم اور بے گناہ انسان کے ساتھ درندگی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ برہیت ہے..... انسانیت کے ساتھ ایک سیما بک مذاق ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کا پاس کوئی خطی انسان ہے۔“ وہ زہر خند لمبے لمبے بولے۔

”ڈاکٹر! چپ جذباتی ہو رہے ہیں۔“ وہ ہنسا اس کا چہرہ اور کردہ دکھائی دینے لگا۔ ”آپ ذرا غصہ سے دل اور سنجیدگی سے سوچیں۔ کیا یہ ایک ایسا سنسنی خیز اور دلچسپ تجربہ نہیں ہے جو دنیا میں آج تک کسی نے نہیں کیا؟ میرا پاس ایک ایسا تجربہ کر رہا ہے جس سے نہ صرف انسانیت بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ طب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آنے گا۔ میرے پاس اور مسٹر سالار کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔“

”اگر آپ بھی اپنی آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن کسی سواری کی آنکھوں سے کرائیں تو یہ تجربہ اپنی مثال آپ ہو گا۔“ میں نے طنزیہ لمبے لمبے کہا۔

”مسٹر سالار! میری بات سن کر اس کے چہرے پر تاؤ پیدا ہو گیا۔“ آپ زبان سنہال کہات کریں۔“

”اس مشورہ کا برا کیوں مان رہے ہیں آپ؟ کیا سواری کی آنکھیں خوبصورت نہیں ہوتیں؟ یوں بھی آپ کسی سواری سے کس نہیں لگ رہے۔“

”مسٹر سالار! اس نے غصے سے فرش پر چیر پھا۔“ اگر آپ نے مزید بکواس کی تو آپ کی زبان بھیچھٹو لوں گا.....“

”کیا یہ بھی ایک نیا تجربہ ہو گا؟“ میں اسے اشتعال دلا رہا تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ مسلح بد معاش میرے پاس مجھے خاموش کرانے کے خیال سے آئے تو میں اس کی شین گن چھین لوں۔ یہاں سے نکلے کے لئے ایک ایسی ہی شین گن کی ضرورت تھی۔

”نیا تجربہ.....؟ تجربات تو آپ پر کئے جائیں گے۔“ وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ ”پہلے تو آپ کو گونگا کیا جائے گا۔ اس کے بعد میرا بنا دیا جائے گا۔ پھر آپ کی

”یہ دولت بنگلہ دیش کے غریب لوگوں پر بھی تو خرچ کی جاسکتی ہے جنہیں ایک وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہے۔“

”وہ غریبوں ہی پر تو خرچ کر رہے ہیں؟“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کو کسی وقت بتاؤں گا کہ غریبوں کی کس طرح مدد کی جا رہی ہے۔“

”مجھے آپریشن کے لئے دو ڈاکٹروں اور نرسوں کی ضرورت پڑے گی جو.....“

ڈاکٹر قدرت خدا نے کہا تو وہ درمیان میں بولا۔ ”آپ اس کی فکر نہ کریں آپ کو جن لوگوں کی جس چیز کی ضرورت ہے وہ حاضر کر دی جائیں گی۔“

”تو کیا آپ مجھے آپریشن تعمیر کھڑا نہیں گے.....؟ میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولے۔

”کیوں نہیں؟..... چلے۔“ جعفر دروازے کی طرف گھوم گیا۔

وہ باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھے تو سریتان سب کے پیچھے تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کے آنکھوں سے رکنے کا اشارہ کیا اس نے میرے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں ہنگامے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا تو میرے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ اس خیال سے میرا دماغ مستحضر تھا کہ میری آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن ہو گا۔ میری آنکھیں نکال کر ان کی جگہ چیتے کی آنکھیں لگا دی جائیں گی اور میری آنکھیں اس درندے کو۔ اگر میں یہاں سے فرار نہیں ہوں تو میرا حشر بڑا بھیاں ہو گا۔ صرف یہی نہیں مجھے ہراساں کر رہا تھا کہ میری آنکھیں بچنے کے بجائے بے بند کر دیا جائے گا تاکہ وہ درندہ مجھے چیر پھاڑ کے کھا لے۔

اس لرزہ خیز آپریشن سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اس چیتے کے بچنے میں دو ایک دن کی دیر تھی۔ میرے پاس دو دن تھے جن کا ایک ایک لمحہ میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔ ان دونوں میں مجھے یہاں سے کسی بھی قیمت پر فرار ہونا تھا اسی صورت میں میری جان بھی بچ سکتی تھی۔ فرار کا منصوبہ سریتا کے تعاون کے بغیر نہیں بن سکتا تھا۔ سریتا نے اپنی طرف سے مدد کا یقین تو دلایا تھا مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا اور اس گاؤں کے محل وقوع کے بارے میں بھی معلوم کرنا تھا۔ سریتا سے ایک آس سی بندھ گئی تھی۔ سریتا نے کل مجھے کچھ نہیں بتایا تھا اور میرے بہت سارے سوالوں کا جواب نہیں دیا تھا۔ آج اس کے خیالات میں تبدیلی آئی تھی۔ شاید ڈاکٹر یا میری آنکھوں کے

تبدیلی کے آپریشن سے خوف سے.....

پھر میں کمرے میں ملتا ہوا افراد کے منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایسی کوئی تدبیر جو میں اس جہنم سے نکل سکوں۔ اس سوچ میں نصف گھنٹہ گزر گیا۔ سریتا میرے لئے کافی لے آئی۔ وہ آئی تو بڑی پریشان سی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے فکر مندی جھانک رہی تھی۔

”کیا بات ہے آپ بہت پریشان نظر آ رہی ہیں؟ خیریت تو ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔

”جی خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ سریتا نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”میری ساتھی نرس پارو ہے..... کل اسے اس بڑے پر بھیجا جا رہا ہے جہاں اس تنظیم کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں یہاں اکیلی رہ جاؤں گی۔“

”پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں سریتا!“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”میں آپ کو یہاں رہنے نہیں دوں گا“ فرار ہوتے وقت آپ کو بھی ساتھ لیتا جاؤں گا“ اس کے لئے حوصلے اور مدد کی ضرورت ہے۔

”ج!“ ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ دمک کر بھگ سا گیا۔ ”کیا کامیابی کی کوئی امید ہے؟“

”کو شش کرنا ہمارا کام ہے“ باقی کام اللہ کا ہے۔ اللہ نے جہاں تو ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ..... ہم اس بے چاری پارو کو بھی اپنے ساتھ لے لیں۔“ اس کے چہرے پر ایک گھٹاسی جھانکی اور آنکھوں میں اداسی گہری ہو گئی۔ ”وہ غریب اپنے گھروالوں کو یاد کر کے رات دن تڑپ رہتی ہے۔“

”یہ ایک فطری بات ہے۔ کیا آپ کو اپنے گھروالے یاد نہیں آتے؟“

”کیوں نہیں یاد آتے.....؟“ وہ سانس لے لے کر کہنے لگی۔ ”میری بیوہ ماں“ میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بڑی بہن ہے۔ میری بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ برسوں کے بعد ہمارے گھر میں ہمارا آ رہی تھی۔ خوشی کے دن آ رہے تھے۔ اب تو وہاں میری گمشدگی سے ایک قیامت آگئی ہو گی۔ ساری خوشیاں ملیا میٹ ہوئی ہوں گی۔ میری ماں اور بہن کا دور کر رہا حال ہو گیا ہو گا.....“

اس کی آواز بھرا گئی اس کی آنکھوں میں موتی دسکے لگے تو اس نے اپنی بات

ادھوری پھوڑ دی۔ وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے گی۔ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں بھی اپنے گھر والوں کو یاد کر کے خوب روتی ہوں۔ میں تو اب ان سے ناامید ہو گئی ہوں کہ ان سے ملنا بھی نصیب ہو گا۔ یہاں کے آدمی اور پرے دار بتاتے ہیں کہ..... یہاں جو بد نصیب ایک بار اٹھیا وہ واپس جانے کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔ اب وہ یہاں سے سیدھا قہری میں جا گئے۔“

”اب رونے کے بجائے ایک پتول یا ریو اور کہیں سے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے فرار میں آسانی ہوگی۔“

وہ سوچنے لگی۔ پھر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ ”نہ صرف ریو اور بلکہ چاقو کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔“

”دیر پنی ٹلے.....“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”مجھے اس گاؤں کے محل وقوع کے علاوہ یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں کتنے گھر ہیں۔ کہاں کہاں ہوتے ہیں۔ کتنی لائیں، گاؤں اور موڑوں ہوتی ہیں۔ جعفر کی رہائش گاہ کہاں ہے۔ کتنے ٹیلی فون ہیں۔ یہاں لوگ دن میں آتے ہیں یا رات میں..... کیا یہاں قریب سے لائیں اور شیر بھی گزرتے ہیں؟“

”میں یہ ساری تفصیلات آپ کو ایک کانڈ پر لکھ کر صبح تک پہنچا دوں گی۔ یہ ناشتے کے ساتھ ساتھ آجائیں گی۔“

”اب مجھے اندر سے میں امید کی کرن پیدا ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس خوشی میں کیا گرم گرم کافی نہیں پلاؤ گی؟ یہ تو جعفری ہو گئی ہے۔“

وہ رات کا کھانا لے کر آئی تو ٹوٹے میں ایک ریو اور دو تیس چالیس گولیاں بھی ساتھ لیتی آئی۔ ایک خوفناک قسم کا چاقو بھی اس کے پاس تھا جو وہ اپنے پٹھوں میں چپا کر لائی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ چاقو اور ریو اور وہ اسلحہ کے شور سے لے کر آئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں یاد کو وجہ سے حاصل ہو سکی ہیں۔ پھر وہ دیکھ کر فوراً واپس چلی گئی اس لئے کہ بارو نے اس شور کے پرے دار کو اپنے کمرے میں بلا کر روکا تھا اور اس کا دل بھلا رہی تھی۔ سریتا نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ دونوں چیزیں شور سے اڑائی تھیں۔ میں نے دونوں چیزیں بستر کے نیچے رکھ دیں۔ ان دونوں چیزوں کو پاکیری خوشی کی اتھانہ دی تھی۔ مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہو گئی تھی۔ میری کس نس میں خون جیسے رقص کرنے لگا تھا۔ میری مشکل کسی حد تک آسان ہو گئی۔ یہاں سے جملت پانے کی

صورت تو نکل آئی تھی۔ میں نے یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب صبح کا انتظار تھا۔ اس نقشے اور تفصیلات کا انتظار تھا جو سریتا نے کر آنے والی تھی۔ میں ان کی مدد ہی سے منصوبہ بنا سکتا تھا۔

میں رات چار بجے تک سو نہیں سکا۔ میرے ذہن میں کتنے ہی منصوبے آرہے تھے۔ ان خیالوں نے مجھے سوئے میں دیا۔ میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ سریتا نے مجھے بیدار کیا۔ وہ میرے لئے بیڈنی لے کر آئی تھی۔ وہ بیڈنی دے کر چلی گئی۔ اس نے مجھ سے زیادہ بات نہیں کی۔ اس نے اشارے سے بتایا تھا کہ ایک پرے دار دروازے کے باہر کھڑا ہے اور دروازے سے کان لگائے ہوئے ہے۔

میں شیو کر کے نما کے فارغ ہوا تھا کہ سریتا نے میں ناشتے لے آئی۔ ناشتے کی مقدار دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بھی میرے ساتھ ناشتہ کرے گی۔ جب اس نے ٹینک میں میری طرف بڑھا یا تو اس کے اندر ایک کانڈ تھا کہ کیا ہوا تھا۔ میں نے وہ کانڈ اٹھا کر جب میں رکھ لیا۔ سریتا نے دلی زبان میں بتایا کہ یہ نقشہ اور ساری تفصیلات بارو نے ساری رات جاگ کر بتائی ہیں۔ وہ ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئی۔ سریتا نے ناشتے کے اختتام پر کہا۔ ”خدا کرے یہاں ہمارا آخری ناشتہ ہو!“

”آمین.....“ میرے دل کی اقامہ گہرائیوں سے آواز نکلی۔

☆-----☆-----☆

وہ کافی بنانے کے لئے برتن اٹھا کر چلی گئی تو میں نے غسل خانے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے تمہ کیا ہوا کانڈ کھولا۔ کانڈ کے ایک طرف نقشہ بنا ہوا تھا۔ یہ نقشہ کم ایک طرح کی پینٹنگ تھی۔ وہ مصور معلوم ہوتی تھی۔ یہ گاؤں جزیرہ نما تھا۔ اس کے اطراف پانی تھا۔ یہ گاؤں درختوں میں گھرا ہوا تھا اور دروازے غیر آباد دکھائی دیتا تھا۔ یہاں پانچ عمارتیں تھیں۔ ایک عمارت جہاں کی تھی دوسری عمارت آپریشن جعفری کی تیسری عمارت میں اسلحہ اور دوسری چیزوں کا سٹور تھا۔ چوتھی عمارت میں پرے داروں اور ملازمین کی رہائش گاہ تھی۔ پانچویں عمارت جو ایک منزلہ تھی اس میں جعفری کی رہائش گاہ اور دفتر بھی تھا۔ یہ تمام عمارتیں درختوں کے درمیان اس طرح سے گھری ہوئی تھیں کہ کسی طرف سے گاؤں سے باہر سے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ یہ تمام عمارتیں ایک دوسرے سے قریب قریب تھیں۔

کانڈ کے دوسری طرف جو تفصیلات لائچ اور آدمیوں کے بارے میں لکھی ہوئی

پارو کڑی مسکرا رہی تھیں، میں نے پارو کو دیکھا وہ نہ صرف بہت حسین تھی بلکہ نہ کشش بھی تھی۔ میں نے تین جوان لڑکیوں کو دیکھا جو ایک چچ پر طوفان کے خوف سے سہمی چڑیا کی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے سفید پڑے چلے گئے تھے اور ان میں جیسے لوہ کی ایک بوند بھی نہ ہو وہ مردوں سے بھی بدتر دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی پچنی پچنی ویران آنکھوں میں سے دہشت جھانک رہی تھی اور آنسوؤں سے بھری تھیں ان کی حالت اس طرح سے غیر ہو رہی تھی جیسے انہیں سولی پر چڑھائے جانے کا اندیشہ ہو۔ ان کا لباس اور بال بھی بکھرے ہوئے تھے وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مردوں سے اچھے لکھانوں کی لگ رہی تھیں، بندو ان تینوں کو لچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور جعفر سے کہہ رہا تھا۔ ”سرا! آپ ان تینوں کو کل جڑے پر نہ بھیجیں۔“

”وہ کس لئے.....؟“ جعفر نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں سر!“ اس کا جملہ بڑا معنی خیز تھا۔

”میں خود بھی نہیں جانتا کہ ایسے انمول بہروں کو کل ہی جڑے پر بھیج دوں۔“ جعفر ان تینوں کی طرف گہری نظروں اور شیطانی مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔ ”لیکن انہیں یہاں ایک رات رکھنے سے کیا ہو گا میں باس کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا کہ ان کا ٹیلیفون آ گیا تو.....؟“

”آپ ان کی بیماری کا بھانڈا کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ تینوں کو تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔“ بندو نے جعفر کو مشورہ دیا۔

”ہاں..... یہاں چلے گا۔“ جعفر کا چہرہ انجائے خیال سے کھل اٹھا۔ ”تو پھر آج کی رات جشن کا اہتمام کرو۔“ انہیں سرتا اور پارو کے حوالے کر دو تاکہ وہ انہیں دلبہوں کی طرح سنوار سکیں۔“

سرتا ہماری طرف دیکھ کر استہزائی انداز سے مسکرائی گئی اور جعفر کی طرف دیکھتی ہوئی جلدی سے بولی۔ ”سرا! یہ لیجئے۔ آپ کے باقی آگے پہلے ان دونوں سے نہیں پھر جشن منائیں۔“

جعفر اور بندو نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ جعفر نے ہم دونوں کو ذہریلے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”اچھا تو آپ دونوں تشریف لے آئے۔“

”آپ کے آدمیوں نے ہم دونوں کے ساتھ بڑی ذلت کی ہے۔“ ڈاکٹر قدرت خدائے شکایت کی۔ ”آخر مارا قصور کیا ہے؟“

”قصور.....؟“ جعفر اپنی کرسی چھو ڈکرا کھڑا ہوا۔ وہ ہم دونوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ”قصور یہ ہے کہ آپ دونوں آپریشن والے دن یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”یہ بات آپ سے کس نے کہی؟“ ”کس نے کہی.....؟“ جعفر سرتا کی طرف دیکھ کر زہر خندا انداز سے مسکرائے لگا۔ ”کس سرتا نے..... سنا ہے کہ آپ نے اس مقدمے کے لئے اس پر محبت کا جال پھینکا۔ اسے شادی کا لالچ دیا سبز باغ دکھائے آپ یہ بھول گئے کہ یہ آپ کی نہیں میری محبوبہ ہے۔“

میں اب سمجھ گیا کہ سرتا نے ہم دونوں کو یہاں بلائے کے لئے کیا جال پھینکا۔ اس کی جال کا سیب رہی تھی کمرے میں اتفاق سے جعفر اور بندو تھا اور چارہد معاش اور بھی تھے تین حسین اور معصوم لڑکیاں بھی تھیں جن کے ساتھ داویش منانے کے خواب یہ دونوں شیطان دیکھ رہے تھے۔ وہ بد نصیب بھی برآمدے میں زخموں سے چور کر رہے تھے اب مجھے اپنی تدبیر پر عمل کرنا تھا یہ کام آسان آسان بھی نہیں لگ رہا تھا۔

میں نے سرتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سرتا! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی تم مکار، فریبی اور دغا باز نہیں میں نے فرار کا منصوبہ نہیں بنایا تھا میں نے تو تم سے اتنا کہا تھا کہ کسی طرح مجھے اسے آپریشن سے نجات دلا دو تو میں تم سے شادی کر لوں گا۔“

”اب تم سزا کے خوف سے مکر رہے ہو۔“ سرتا نے غصہ ہو کر کہا۔ ”تم نے مجھے کس تدبیر پریشان کیا میں جس معاف نہیں کروں گی۔“

”مسٹر سالار!“ جعفر وہاں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ کے خیال میں یہاں سے فرار ہونا بہت آسان ہے؟ نہیں مسٹر سالار!..... نہیں۔ آپ ایک کیا دس سرتاؤں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں تو فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہاں پر اور اس تنظیم میں جتنے بھی لوگ ملازم ہیں وہ اس دیش کے ایک سے ایک خطرناک اور مغرور مجرم ہیں، چیشر و قاتل ہیں ان کے نزدیک کسی کو قتل کر دینا ایسا ہی ہے جیسے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مار دینا۔ یہ لوگ رات دن سخت پہرہ دیتے ہیں یہاں سے کسی کا فرار ہونا ناممکن ہے۔“

”خیر ایسا بھی نہیں ہے۔“ میں نے اسے چیلنج کے انداز میں کہا۔ ”مجھے تین چار دن کی مصلحت دی جائے تو میں یہاں سے فرار ہو کر کھاسکتا ہوں۔“

”اگر تم نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکالا تو میں پھر ایسی ہی ایک لک اور تمہاری پہلی پر لگاؤں گا..... چلا کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں تم کس لئے جیج رہے ہو۔ اس طرح تم اپنے ان ساتھیوں کو خبردار کرنا چاہتے ہو جنہیں پارہ بلانے لگی ہے۔“

میری دھمکی کا رگڑ ثابت ہوئی۔ بندو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر جعفر نے لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مسٹر سالار! تم یہ مت بھولو کہ تم اور تمہارے یہ ساتھی میرے پاس کے انتقام سے نہیں بچ سکتے وہ کس قدر خطرناک اور ہوشیار ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں اس کے آدمی نہ ہوں۔ اس کی لائیں اور گاڑیاں انسانوں کا شکار کر رہے تھے لے محکم پھر نہ رہی ہوں۔ ہمیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس کی بڑی عیاںک سزا ملے گی۔“

”جعفر! کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ اب تمہارے پاس کے دن بھی گئے جا چکے ہیں۔ اب اسے بھی اپنے ظلم و ستم کا ایک ایک حساب دینا ہو گا۔ قدرت نے شاید اس کا خاتمہ کرنے کے لئے مجھے اپنی دور سے یہاں بھیجا ہے میں اس آئندہ صفت آدمی کو قانون کے حوالے کر کے رہوں گا جو انسانوں کا شکار کرتا ہے..... تم بھی اس کے ساتھ نیست و نابود ہو جاؤ گے۔“

جعفر میری بات سن کر ہنسنے لگا اس کی ہنسی اتنی زہریلی تھی جیسے وہ تنگے بدن کو کسی خنجر کی نوک کی طرح کاٹتی جا رہی ہو۔ میرے جی میں تو آیا کہ اس کی کھوپڑی میں ایک نہیں پورے چھ سو داغ کر دوں پھر اس نے اپنی ہنسی کو روکنے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سالار! یہ تمہاری عارضی فتح ہے۔ اس کا خوب جی بھر کے جشن منالو۔ جیسے ہی تم لوگ یہاں سے نکلو گے میرے پاس کے آدمی تم سب کو گرفتار کر لیں گے..... پھر تم سب کا جو حشر ہو گا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تمہارے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دیئے جائیں گے۔ دینا دلوں کو تم سب کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔“

اس کی باتیں سن کر لڑکیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور ان کے چہرے بھر سفید پڑتے چلے گئے۔ یہ بھی اس کی ایک چال تھی وہ ہمیں خوفزدہ کر رہا تھا دوسری طرف اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آ جاؤں گا میں محتاط اور چوکنا کھڑا رہتا ہوں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہاں کا بھی انتظار تھا میں جانتا تھا کہ جعفر مجھے باتوں میں لگا کر غافل کرنا چاہتا ہے۔ وہ شاید بندو کو اشارے بھی کر رہا تھا بندو کی نگاہوں کی

زبان غیر محسوس انداز سے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر قدرت خدا سے کہا۔ ”ذرا آپ بھی اس سوار پر نظر رکھیں یہ دونوں پر قول رہے ہیں۔“

سریتا اندر داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لٹاؤ اور ایک فرسٹ ایڈ کس تھا جس میں انجکشن اور سرنج تھے۔ ڈاکٹر قدرت خدا اور سریتا نے مل کر فرسٹ پرست کے گلے لپٹے ہوئے بد معاشوں کے بازوؤں میں انجکشن لگانا شروع کر دیئے جب وہ دونوں ان سب کے انجکشن لگاتے تو سریتا ایک سرنج لے کر میرے پاس آئی تاکہ جعفر کے انجکشن لگا دے۔ ”اے انجکشن نہیں لگائے.....“

”وہ کیوں.....؟“ سریتا نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر مجھ سے بولی۔ ”آپ اس موڈی سانپ کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔“

”ہم اس سانپ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اس سوار کو بھی..... تاکہ راستے میں ان کے آدمی ملیں تو ہم انہیں ڈھال بنا سکیں۔“ پھر میں نے سریتا کو مختصر طور پر بتایا کہ ان دونوں کے ساتھ رہنے سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

”پارہ اب تک ان بد معاشوں کو لے کر یہاں کیوں نہیں پہنچی.....؟“ سریتا تشویش سے بولی۔ ”میں دیکھ آؤں.....“

اس کا جملہ ادھر ادھر گیا پھر ہم سب نے ایک حیران کن اور خوش کن منظر دیکھا چاروں بد معاش ایک قطار میں جنگی قیدیوں کی طرح اپنے ہاتھ اٹھائے اندر داخل ہو رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے پارو تھی۔ پارو کے ہاتھ میں شبنم کن تھی۔ پارو نے اندر داخل ہو کر ان بد معاشوں کو فرسٹ پرست پر اندھے سے ملٹ جانے کا حکم دیا تو انہوں نے ذرا سی چوں چرا بھی نہیں کی۔ سعادت مند شاگردوں کی طرح انہوں نے حکم کی تعمیل کی تھی۔

سریتا نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس نے ان چاروں بد معاشوں کے بازوؤں میں بھی سوئی ٹھونپ دی جن بد معاشوں کو پہلے سوئی لگائی گئی تھی ان پر غنودگی چھانے لگی تھی۔ پارو نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیا کرنا چاہئے.....؟ سارے بد معاش یہاں آچکے ہیں۔“

”اب ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہئے۔“ میں نے کہا۔ ”بدمی کنارے تیز اور

جدید ترین لالچ لکڑی سے ہم کبھی قریبی شہر میں جلد پہنچ سکتے ہیں۔“

”ایک کام اور باقی رہ گیا ہے مسٹر سالار! سریتا بولی۔ ”جعفر کی خوب گاہ کی الماری

میں ہزاروں تو لے سوتا ہزاروں لاکھوں ناکا اور چھوٹا موٹا اسلحہ پڑا ہے جو مسافروں سے لوٹا ہوا مال ہے کیا خیال ہے اسے بھی لے لیا جائے....."

"کیوں نہیں....." میں نے سر ہلایا۔ "کاش! میرے پاس بم ہوتے تو میں ان عمارتوں کو دھماکوں سے اڑا دیتا۔"

"شور روم میں بیٹروں کا اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ ان تمام عمارتوں کو آگ لگائی جاسکتی ہے۔" پارہ بولی۔ "میرا خیال ہے کہ اس گاؤں کو چاروں طرف سے آگ لگا دینا چاہئے تاکہ اس شخص کا نام و نشان نہ رہے....."

"نہیں..... نہیں۔" ڈاکٹر قدرت خدا جلدی سے بولے۔ "ایسی حماقت کی ضرورت نہیں یہ گاؤں اور عمارتیں کل لوگوں کے کام آئیں گی جب ہم پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ درج کرائیں گے پولیس اس علاقے پر کنٹرول حاصل کر لے گی یہاں ہو سکتا ہے ہسپتال اور سکول بھی کھول دے جس سے آس پاس کے گاؤں والوں کو فائدہ پہنچے....."

"ڈاکٹر ٹھیک کہتے ہیں پارہ!" میں نے تائیدی لیے میں کہا۔ "دو ایک ہفتے میں یہ گاؤں نہ صرف پوری طرح تباہ جائے گا بلکہ طوفان اور سیلاب کے دنوں میں آس پاس کے چھوٹے گاؤں والے یہاں آکر محفوظ رہ سکیں گے۔"

سمرتا ان تینوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر بلائی منزل پر چلی گئی اور صبا رونے کہیں سے سی تلاش کر کے دی تو میں نے جعفر کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے لے جا کر انہیں مضبوطی سے باندھ دیا اور پھر چارو نے دوسری رسی سے پھندا بٹا کر اس کے گلے میں ڈال دیا تاکہ اسے کسی جانور کی طرح ہانک کر لے جایا جاسکے۔ ڈاکٹر قدرت خدا فرسٹ ایڈ بکس لے کر برآمدہ میں چلے گئے تاکہ ان دونوں نوجوان مردوں کی مرہم پٹی کر سکیں۔ اور صبا نے جعفر کو کرسی سے اٹھا کر دیوار کی طرف کھڑا کر دیا اور اس کی جامہ تلاشی تو اس کی جیب سے ایک بھاری بٹو اور پتول ملا میں نے بڑا کھول کر دیکھا تو اس میں چار پانچ ہزار کی رقم چھوٹے بڑے نوٹوں کی شکل میں تھی اس کے علاوہ ایک چھوٹی اور پتی ٹوٹ بک بھی تھی جس میں بہت سارے نام پتے اور لیٹینوں نمبر درج تھے۔ پھر میں نے اس کی کلائی سے دستی گھڑی بھی اٹا لی جو بیروں کی تھی یہ گھڑی میں بائیس ہزار ناکا سے کم نہیں تھی۔ یہ گھڑی کس کی تھی مجھے معلوم تھا۔

"سمرتا! راب یہ آپ شکاری سے رہزن کیسے ہیں گئے؟" جعفر نے تعجب آمیز انداز

میں کہا۔

"شکاری کا کام شکار کرنا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "جس طرح تمہارا پاس انسانوں کا شکار کرتا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں شکار کر رہا ہوں اور تمہاری ہر چیز پر قبضہ کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں تمہاری نہیں ہیں یہ گھڑی میرے دوست مشتاق چوہدری کی ہے گویا تم اس کے قاتل ہو۔"

"مشتاق چوہدری.....؟ ہاں اس کا قاتل ہوں۔" جعفر نے اعتراف کیا۔ "یہ وہ پہلا شخص تھا جو زیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر میں نے اسے شدید زخمی کر دیا تھا اسے فوراً مرنے چاہئے تھا مگر وہ مرا نہیں اپنے شہر جا کر ایک دن موت و زندگی کی کشمکش میں رہ کر مر گیا بدراخت جان تھا۔"

"مشتاق چوہدری میرا دوست تھا میں نے اس کی موت پر قسم کھائی تھی کہ میں اس کی موت کا بدلہ لے لے کر رہوں گا اور....." دو فٹا ایک دل خراش چیخ فضا میں بلند ہوئی جو پارو کی تھی۔ "سالار..... چچا..... یہ شور....."

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اڑیوں پر گھوم گیا میں نے اپنے دشمن کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ بندو کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور وہ کسی شکاری کتے کی طرح غرائز اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر چکا تھا اور مجھ سے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو اس کا خنجر میرے بدن میں اتر چکا ہوتا۔ میں نے چھپکائی دی تو خنجر میرے سر کے بالوں میں سے گزرتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ جب اس نے اپنا نشانہ خطا دیکھا تو کسی درد نہ کی مانند اس نے مجھ پر جست لگائی اس کا یہ وار بھی خالی گیا۔

میں نے اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے اس کی پہلی میں بوٹ کی نوک اس زور سے دے ماری کہ وہ بلبلار کر تو بے لگا اس کی حالت دم توڑتے ہوئے زخمی پر بندے کی سی تھی۔ پارو بیانی انداز میں چیخا۔ "سالار! یہ سانپ ہے سانپ..... آپ اسے گولی مار دیں یہ مجھے دہشتے سے بری طرح ڈستار پہا ہے سالار..... یہ آپ کو بھی موقع ملے پر جان سے مار دے گا....."

"نہیں....." میں نے پارو سے کہا۔ "اے سزا قانون دے گا۔ میں قانون کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا۔"

"سزا..... نہیں سالار نہیں..... یہاں سزا مجرموں اور ظالموں کو نہیں ملتی سزا کے لئے غریب اور مظلوم پیدا ہوتے ہیں اسے جیل ہو جائے گی اس پر دو تین برس

مقدمہ چلتا رہے گا پھر یہ رہا ہو جائے گا..... سزا تو مجھے سادی زندگی کے لئے ملی ہے..... "پارو بڑی جذباتی ہو رہی تھی اس کا لہجہ وحشی ہو رہا تھا اس کی آنکھیں لال لال ہو رہی تھیں وہ کسی وحشی قاتل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔
"اس کی سزا موت ہو گی اس لئے کہ اس نے انسانوں کو ذبح کیا ہے افسران کو قتل کیا ہے۔ قانون اسے تجھ دار پر لٹکا دے گا....."

پارو پر یک لخت انتقام کا جنون سوار ہو گیا تھا میں اسے روکتا ہی رہ گیا اس نے شین مگن شانے پر رکھ کر بند پر برست دے مارا۔ بندو بے اپنا ہی کی طرح تڑپ کر ہٹتا ہوا گیا اور پارو شین مگن کا جھکا ہوا داشت نہ کر سکی وہ فرش پر شین مگن سمیت گر پڑی میں نے لپک کر اسے اٹھایا دوسرے ہاتھ میں شین مگن لے لی۔ "یہ تم نے کیا کیا پارو.....؟ اس درندے کو تم نے اس آسانی سے مرنے دیا۔"

"میں نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے....." اس کی ناسیں بری طرح پھول رہی تھیں اور اس کا چہرہ جھٹتا رہا تھا۔ وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
"میرے اندر انتقام کی جو آگ بجڑ رہی تھی آج وہ بجھ جائے گی کاش! یہ کیڑہ بھڑندہ ہو جائے میں اسے پھر بھون ڈالوں....."

تب وہ کسی نوٹے ہوئے دردازے کی طرح میرے سینے سے آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اس کے بازو کو سسلاتا ہوتے تسلی دینے لگا اور اسے سرتا اور وہ لڑکیوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ ڈاکٹر قدرت خدا بھی آگئے ان سب نے بندو کی لاش خون میں لت پت دیکھی تو وہ اپنی جگہ ٹھنک گئے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ بندو کومیں نے قتل کیا ہے۔

"مغز سارا" ڈاکٹر قدرت خدا بولے۔ "آپ نے بڑی جلدی کی اسے قتل نہیں کرنا چاہتے تھا۔"

"میں نے نہیں پارو نے اسے قتل کیا ہے اس سے اپنے ظلم و ستم کا بدلہ لیا ہے۔" میں نے انہیں بتایا۔

"پارو نے اچھا کیا....." سرتا بندو کی لاش کے قریب جا کر اس کے منہ پر قبضہ کرتی ہوئی بولی۔ "اس نے عورت کو ایک کھلوٹا سمجھ رکھا تھا اس کیبنے نے حد کر دی تھی۔" پھر اس نے بندو کے چہرے پر ایک لات رسید کی۔ "ذلیل..... آخر تم کتے کی موت مرے نا....." وہ کسی آگم کی طرح پھنکاری۔

"سرتا!" میں نے کہا۔ "یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ دن ڈوبنے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے۔ تم نے اپنا کام ختم کر لیا؟"
"نہیں....." کچھ کاہتی ہے۔ "سرتا نے جواب دیا اور وہ ان جیوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر اوپر چلی گئی۔

میں نے بندو کی طرف دیکھا اس کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے بھجلی ہو گیا تھا اور ابھی تک زخموں سے خون ابل رہا تھا۔ اس کی کلی آنکھیں جو چھت کو تک رہی تھیں ابھی بھانک ہو گئی تھیں کہ انہیں دیکھ کر بدن پر بھر بھری سی آگمئی تھی۔

پارو کے آنسوؤں نے میرا گردن بھگو دیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے الگ کر کے جیب سے رومال نکالا۔ اس کے آنسوؤں کو پونچھتا ہوا بولا۔ "پارو! اب چلنے کی تیاری کرو۔ ہمیں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے لینا چاہیے۔ کیوں؟"

تھوڑی دیر کے بعد ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو سرتا اور ان لڑکیوں نے کچھ چیزیں اٹھا رکھی تھیں جن میں سونے کے زیورات اور رقم تھی۔ زخمی مرد اس قابل تھے کہ چل سکیں۔ سرتا بے ہوشی کے انجھٹن کے ساتھ ساتھ طاقت کے بھی انجھٹن اور دو انیاں ڈھنکری سے لے آئی تھی۔ ڈاکٹر قدرت خدا نے ان دونوں جانوروں کو انجھٹن لگا دیئے تھے۔ پارو نے وہی رسی پکڑی ہوئی تھی جس کا پھندا اجعفر کے گلے میں پڑا تھا۔ اسے قربانی کے جانوروں کی طرح کھینچنے لے جا رہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں ریلو اور دوسرے ہاتھ میں ایک شین مگن تھی۔ ان دونوں مردوں کے ہاتھ میں بھی اسلحہ دے رکھا تھا۔ ڈاکٹر قدرت خدا کے ایک ہاتھ میں دوواؤں کا تھیلہ اور فرسٹ ایڈ بکس تھا۔ دوسرے ہاتھ میں جو تھیلہ تھا اس میں کھانے کا سامان.....

سرتا نے لانچ کے پاس رک رکھ کر پوچھا۔ "یہ لانچ کون چلائے گا؟ لانچ کے آدیمیں کو تو ہم نے انجھٹن لگا دیئے ہیں۔"

"میں چلاؤں گا....." میرے بجائے ڈاکٹر قدرت خدا نے جواب دیا۔
"سرا! آپ کو لانچ چلانا آتی ہے....." سرتا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"کیوں نہیں....." وہ بولے۔ "میری دو تین مسافر لائیں ہیں۔ اس کے علاوہ میری اپنی ایک ذاتی لانچ بھی ہے جو بالکل ایسی ہی ہے۔ میں انکڑنا گانگ سے سندپ یا باریلال فیملی کے ساتھ جاتا ہوں تو اسے میں اور میرے بچے چلاتے ہوئے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ میں کلینک بھی ہوں۔ انجن میں کسی قسم کی خرابی ہو جائے تو میں خود ہی اسے ٹھیک بھی کر لیتا ہوں۔ یہ لاچ چلانا تو بہت آسان ہے۔ اسے تو کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔“

ہم سب جلدی سے اس لاچ میں سوار ہو گئے۔ عرشہ سے نیچے آگئے جہاں تین چار کینبن بنے ہوئے تھے اور ایک بڑا ڈانگ ہال ساتھ۔ اندر تمام تر سولتیں موجود تھیں اور اندر سے خوب آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس لاچ کو دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ یہ تفریح کے لئے تھی۔ سزتا اور پارونے بتایا کہ یہ لاچ ان کے لئے بنی نہیں ہے۔ انہیں اکثر یہیں لایا جاتا تھا اور اس لاچ سے ان کی اذیت ناک یادیں وابستہ تھیں۔

ان زخمی مردوں کو ایک کینبن میں لٹا دیا گیا سرتاب کے لئے کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔ وہ ٹھنڈا اور لڑکیاں صبح سے بھوکی تھیں۔ میں جعفر کو لے کر کاک پٹ میں آ گیا۔ اسے ایک کونے میں بٹھادیا۔ ڈاکٹر قدرت خدا نے اس کا انجن شارٹ کیا۔ لاچ چل پڑی میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ پارو اوپر آگئی اور عرشے پر کھڑی ہو گئی۔ ہم اس منحوس گاؤں کو دیکھ رہے تھے جو کسی جنم سے کم نہیں تھا۔ پارو کی آنکھوں میں آنسو بہ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا یہ آنسو خوشی کے ہیں یا غم کے..... لاچ نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ گاؤں ہم سے دور ہوتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اوپنے اوپنے درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

میں نے جعفر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر مرونی تھی اور وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں سے چشمہ اتار کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ مگر گڑا نے لگا کہ میں اس کا چشمہ واپس کر دوں اس لئے کہ یہ چشمہ دور کی نظر کا تھا۔ میں اس خبیث کا پورا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ واقعی بڑا مکروہ اور بھیانک تھا۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد اس کا چشمہ اسے واپس کر دیا۔

ہم تینوں ڈوبے سوج کا نظارہ دیکھنے لگے۔ پارونے مگرے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سالار! آپ یہاں نہیں آتے تو پھر ہمیں موت ہی اس جنم سے نجات دلائی۔“

”یہ قدرت کے کھیل ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں کسی کے کام کو آتا۔“

”ہم آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولیں گے۔“ وہ جذباتی سی ہو گئی۔ ”بھی آپ چاند پور آئیں تو میرے ہاں ضرور آئیں۔“

مجھے اچانک انجانے خوف کا سا احساس ہوا تو میں نے پارو سے کہا کہ اس کا یہاں اس طرح سے کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس گروہ کے بد معاش اپنے سینئروں اور لائچوں میں ستر کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو انہیں شک ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ قدرت اور میں نہ صرف زیادہ ہوں گے بلکہ مسلح بھی ہوں گے اور ان سے لڑنا اور مقابلہ کرنا آسان نہیں ہو گا۔ بہتر ہے کہ وہ نیچے چلی جائے۔ میں اوپر رہوں گا اور سپرہو دیتا رہوں گا۔ می میں گڑنے والی لائچوں اور سینئروں پر کڑی نظر رکھوں گا۔

پارو نیچے چلی گئی تو میں کاک پٹ میں چلا آیا۔ کاک پٹ میں ڈاکٹر قدرت خدا اوٹیل کو کنٹرول کئے کھڑے تھے اور جعفر فریض پر پارو کے سامنے بٹھا دو گھ رہا تھا۔ اب تک کسی سینئر اور لاچ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ ہم سب ایک طرح سے تیار اور اسلحہ سے لیس تھے۔ میرے ہاتھ میں ایک شین مگن تھی۔ جیب میں ریو اور پارو کا تو قبی تھا۔ پارو اور سرتاب بھی بتول اور ریو اور ساتھ لائی تھیں۔ اس کے علاوہ دوا کی بندوبست اور شین گھنیں بھی اس لاچ کے سنور سے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ اس اسلحہ کا استعمال ہر کسی کو نہیں آ سکتا تھا ہم اس کی موجودگی سے ایک طرح تسلی سی تھی۔

ڈاکٹر قدرت خدا نے لاچ کو چلانے کے بارے میں مجھے اچھی طرح سمجھا دیا۔ میں نے ایک ایک بات کو بڑے غور سے سنا اور اسے ذہن نشین کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سرتاب ہم تینوں کے لئے کافی بٹکٹ اور اندازوں کے سینڈ وچ لے آئی۔ جعفر کو مجھے اپنے ہاتھ سے کلکانا پڑا۔ کافی پانا پڑی اس لئے کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے اسے پوری طرح بے دست پیکار کر کے رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی موڈی سانپ سے کم نہیں تھا۔

میرے اور ڈاکٹر قدرت کے بارے میں یہ طے پایا کہ راستے میں کوئی شینیر لاچ چل گئی تو اس میں میرے اور جعفر کے سوا تمام لوگ سوار ہو جائیں گے بھلے وہ کبھی بھی جاری ہو۔ یہ دشمنوں کے ممکنہ سامنا ہونے کے خیال سے سوچا گیا تھا۔ میں اس لاچ میں اس لئے رہنا چاہتا تھا کہ کسی صورت اس جزیرے میں پہنچوں۔ اس بات کا امکان تھا کہ مجھے بد معاش پکڑ کر جزیرے پہنچا دیں گے۔ پھر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ جعفر سے پولیس اس جزیرے کے بارے میں انکوائری تھی۔ لہذا اسے میں نے ڈھالے جا کر پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ان سب سے مشورہ کیا تو ہمیں میری بات پر متفق ہو گئے لیکن انہیں اس بات کا بے حد ڈکھ اور افسوس تھا کہ وہ مجھے اس مصیبت میں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ مجھے خدا پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ دشمن میرا

کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد بہت دور سے ایک شیر آتا دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر قدرت خدا نے لاچ کو روک لیا۔ سب لوگ عرشے پر جمع ہو گئے اور اس شیر کی طرف دیکھنے لگے اور دعائیں بھی مانگ رہے تھے کہ یہ شیر دھن کا نہ ہو۔ شیر کوئی نصف فرلانگ پر ہو گا کہ اچانک خاموشی فضا میں جھفری ہو لاک چبچب بند ہوئی۔ میں اور ڈاکٹر قدرت خدا کاک پٹ کی طرف ڈوڑے۔ سب سے پہلے میں کاک پٹ میں داخل ہوا۔ جھفری جیپیں بند ہو چکی تھیں۔ میں ٹھک کے رک گیا کیونکہ ایک دل خراش منظر نے صرف میرے ہوش اڑا دیئے تھے بلکہ میرے دل پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسا دیکھنے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ڈاکٹر قدرت خدا جو میرے بعد پہنچ کر میرے پاس کھڑے تھے انہوں نے وحشت زدہ ہو کر اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

جھفر خن میں لت پت فرش پر پڑا تھا۔ سر تانے رخصت ہونے سے پہلے اس سے اپنا حساب بے باقی کیا تھا اس کے سینے میں اقدام اور نفرت کی جو آگ بھڑک رہی تھی اسے جھفر کے خون سے ٹھنڈا کیا تھا۔ اس نے بڑے وحشیانہ انداز سے جھفر پر چاقو سے بے درپے وارے کر رکھے تھے۔ چاقو کا چھ سات لچ لچا چل اس کے دل کی جگہ میں اتر چکا تھا اور زخم سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ ہم دونوں دم بخود تھے سر ہاتھ جو نہ چھو نہ سوا رہا تھا اس لئے وہ جھفر کی لاش کو اتنا غماز نظروں سے دیکھ کر استہزا کی انداز سے مسکرا رہی تھی۔

عورت جب اقدام لینے پر آتی ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس نے جھفر سے بڑا بھی ایک اقدام کیا تھا۔ اس سے خوفناک اقدام اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے اقدام لینے سے اس کی عزت واپس مل سکتی تھی مگر اس نے ایک دہرے کو کبھی کر دیا تک پہنچا دیا تھا۔ جھفر آج اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس دنیا سے ایک شیطان کا وجود بیش بہتہ کے لئے مٹ گیا تھا۔

میں سر تیا کو کاک پٹ سے باہر لے آیا۔ ”یہ تم نے کیا کیا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے بھی ویسا جو بارو نے کیا تھا اور ایک عورت کو کرنا چاہئے تھا۔ عورت بہت سارے ظلم و ستم برداشت کر سکتی ہے مگر بے عزت ہونا نہیں..... میں نے او بارو نے ان دونوں دہرے سے اقدام لینے کی قسم کھائی تھی اس لئے کہ ان دونوں خبیثوں نے

ہم دونوں کو کھلوٹا بنا رکھا تھا..... یہ دہرے صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں ہوتی تھی۔ دو تین نوجوان اور معصوم لڑکیاں اور آئی تھیں جو ان دہرے کے ہاتھوں نے ظالم کائی دونوں تک نشانہ بنی رہی تھیں اور ان کے بھائیوں کے ساتھ وحشت و بربریت کا جو سلوک کیا وہ بادل خراش تھا۔ ایک روز ان دونوں بہنوں نے اس شرناک زندگی سے نہایت حاصل کرنے کے لئے فرار ہونے کی کوشش کی تو جھفر نے ان دونوں کو اذیت دے کر قتل کر دیا۔ یہی انسانیت سوز سلوک اس نے ان لڑکیوں کے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ چاقو پیچھے تو ہم دونوں محض اس دن کے لئے زندہ تھے۔ خدا نے آخر میری حسرت پوری کر دی۔“

سر تیا ایک ہی سانس میں بول گئی تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ابھی تک ایک وحشیانہ چمک تھی۔ چہرہ نفرت اور غصے سے تنہا رہا تھا جیسے اس کے انتقام کی آگ ابھی پوری طرح بجھی نہ ہو۔ میں نے اس کی جذباتی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ میں اس وقت وہاں موجود ہوتا تو بے قفل کرنے نہیں دیتا۔ سر تیا اس اقدام نے دشمن تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ جھفر زندہ ہوتا تو پولیس اس جزیرے تک پہنچ کر اس گروہ کا پیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتی۔ اب یہ نامکن ہو گیا تھا۔

اس شیر قریب آ کر رک چکا تھا۔ میں سر تیا کو ساتھ لے کر ریگ کے پاس پہنچا۔ اس شیر میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ اتفاق سے یہ اس شیر کا حصہ سے آیا تھا اور چاند پور سے ہوتا ہوا چٹا گامک جا رہا تھا۔ اتنے سارے مسافروں کو دیکھ کر ایک طرح سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اس شیر اور لاچ پر ایک تیس فٹ لمبا ڈھال کی ریل بنا دیا گیا تھا کہ لاچ سے اس شیر میں جالیا جا سکے اور ایک طرف ایک موٹار سامنے باندھ دیا گیا تاکہ اس کو پکڑ کے تختے پر سے گزر جا سکے۔ سب سے پہلے وہ تین لڑکیاں اور ان کے ساتھی مرد گئے۔ پھر بارو..... ڈاکٹر قدرت خدا رخصت ہوتے وقت مجھ سے بڑی گرجو ش سے بھل گئے اور انہوں نے مجھ سے لئے کا وعدہ لیا۔ سب سے آخر میں جانے والی سر تیا تھی جو میرے شانے پر اپنا سر رکھ کر سسک پڑی تھی۔ وہ آنسوؤں اور سکینوں کی وجہ سے اپنے دلی جذبات اور احساسات کا ذکر نہ کر سکی مگر اس کی آنکھوں میں، میں نے پڑھا تھا۔ آخر میں صرف وہ اتنا کہہ سکی۔ ”مسٹر سارا میں ساری زندگی آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی۔ کاش! میں آپ کے احسان کا بدلہ لاتا رہ سکتی۔“

درد نے اب مجھے چیر پھاڑ کر ہی رکھ دیتے۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں تھا یہ انسان نہیں تھے اس لئے میں نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی قیمت پر ان کے ہاتھ نہیں لگوں گا۔ ان کے ہاتھ لگنے سے مر جانا بہتر ہے۔

جب ان بد معاشوں نے یہ دیکھا کہ میری لاچ تیز رفتار دی سے آ رہی ہے اور ان کی لاچ نے ٹکرا جانے کا خدشہ ہے تو انہوں نے اپنی لاچ ایک طرف کر لی۔ جس وقت میری لاچ ان کی لاچ کے پاس گزرتی تھی تو میں نے ان کی لاچ میں جھانک کر دیکھا۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ یہ دشمنوں کی لاچ ہے۔ اس کے عرشے پر آٹھ دس مسلح لوگ کھڑے تھے۔ اس لاچ سے لاڈلا جھیکر پر ایک آواز گونجی اور خاموش فضا میں تحلیل ہو گئی۔ ”سالارا! رک جاؤ..... اپنی لاچ دوک لو..... نہیں تو ہم تمہاری لاچ کو کم سے کم اڑا دیں گے اور سب لوگ مرجائیں گے۔“

اس دھمکی کا میں نے کوئی اثر نہیں لیا اور میری لاچ تھمکی کا اڑی جاری تھی۔ میں نے پھر اس فحش کو چھتے چلائے سادہ شاید اپنی بات دہرا رہا تھا۔ دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ میری لاچ پرسب لوگ موجود ہیں۔ میں نے چند لمحوں کے بعد پیچھے پیٹ کر دیکھا تو ان کی لاچ بڑی تیزی سے میرے تعاقب میں آ رہی تھی۔ ان کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ فاصلہ تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے اور پھر وہ میری لاچ پر فائرنگ بھی کرنے لگے تھے۔ میں نے لاچ کی رفتار اور تیز کردی تو ان کے اور میرے درمیان فاصلہ تو پھر بڑھ گیا لیکن لاچ کی رفتار کو قابو رکھنا میرے لئے بڑا دشوار ہو رہا تھا اس لئے کہ یہ پانی تھا۔ لاچ پانی کو کاتی ہوئی جارہی تھی۔ تیز رفتاری سے گاڑی اور لاچ چلائے میں بے فرائق تھا اور پھر مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا یہ تو اکثر قدرتِ خدا نے مجھے سکھایا تھا وہ اس وقت میرے کام آیا۔

جب میں نے پھر فاصلہ کو تیزی سے کم ہوتے اور ان کی فائرنگ کو دیکھا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس طرح تو میں ان کے ہتھے چڑھ جاؤں گا کیا تو کوئی میرا کام تمام کر دے۔ میں اپنے بھانجے کے بارے میں سوچنے لگا تو میرے ذہن میں فوراً ہی ایک تدبیر آئی جس کی وجہ سے میں ان کے ہاتھ نہیں لگ سکتا تھا۔ اس تدبیر کے آتے ہی میں نے اس کی ساری بتیاں بجا دیں حتیٰ کہ ہیلڈ لائٹس بھی۔ پھر میں نے دھیل کو لاک کر کے اسے ساکت کر دیا۔ میں کاک پٹ سے باہر نکل کر عرشے پر آیا اور اس کے اگلے سرے پر پہنچا پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو دشمنوں کی لاچ دائیں کنارے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے ہم

اس کے بعد اسٹیئر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ماحول کو تاریکی کی چادر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے پیچھے سے ایک چاور لاکر جعفر کی لاچ پر ڈال دی۔ فرش پر خون سردی کی وجہ سے جلد ہی خشک ہو گیا تھا اور ہم گیا تھا۔ یہ اس درد مندے کا ٹھکانہ تھا جو جانتے جانتے لوگوں کا ٹھکانہ تھا اور اس کے نزدیک انسانی لمبائی سے بھی اڑاؤ تھا۔

میں نے لاچ کا انجن اشارت کیا اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ کیا اس غیثت کی لاچ کو افکارِ پانی میں پھینک دوں؟..... یا پھر اس کی لاچ کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ اس لاچ کو پولیس کے حوالے کرنے سے میرے لئے بڑے مسئلہ پیدا ہو جاتے کیونکہ یہ قتل کا کیس تھا مگر پولیس مجھے قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کر سکتی تھی اس لئے کہ اس چاقو کے دستے پر سربراہ کی اگلیوں کے نشان تھے۔ اس وجہ سے مجھ پر فرد جرم عائد نہیں ہو سکتی تھی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں نے مخالف سمت سے ایک تیز رفتار لاچ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آتی جارہی تھی دیے دیے اس کی رفتار میں کمی آ رہی تھی۔ میری جھمی صا اچانک بیدار ہو گئی اور مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ یہ لاچ دشمن کے آدمیوں کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ دشمن کو شاید کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ہم لوگ وہاں سے فرار ہو چکے ہیں اور ان کی لاچ میں فرار ہو رہے ہیں یہ لاچ اسی لئے ہماری تلاش میں آ رہی تھی اور پھر اس طرح سے ندی کے پتھروں پر چلی آ رہی تھی جیسے راستہ روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اپنی لاچ کی رفتار اور تیز کردی۔ ان کے ہتھے چڑھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ایک تو جعفر کی لاچ اس لاچ کے کاک پٹ میں پڑی تھی دوسرا یہ کہ اسے وحشتانہ انداز سے قتل کیا گیا تھا اور اس کے قتل کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو جاتی۔ اس طرح بندہ دے بے رحمانہ قتل کا بھی میاں ہی ان کی نظروں میں محرم ٹھہرا تو اور وہ مجھے دہرے قتل کا ذمہ دار سمجھ کر سزا دیتے وہ یقیناً بڑی لرزہ خیز ہوتی۔ ایسی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے کہ ہلاک کی روح بھی شرابا جاتی اور پھر میں نے ان کا گاؤں دیکھ لیا تھا جو انہوں نے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھا تھا اور ایک طرح سے ان کے اوٹے کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ علاوہ کس طرح مجھے بخشنے۔ دے دیلے ہی مجھے ناکروہ گناہوں کی سزا دے رہے تھے کہ میری آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن کر رہے تھے اور چپے کی آنکھیں اس کی جگہ لگا رہے تھے۔ یہ

تو اس طرف نہیں آ رہا ہے کیا معلوم ان بد معاشوں کو یہ شک پیدا ہو گیا ہو کہ میں نے چلتی لالچ پر سے پانی میں چھلانگ لگادی ہے۔ ان بد معاشوں نے اپنا شگ و دو کر کے غرض سے کسی ایک بد معاش کو میری تلاش میں ادھر بھیج دیا ہو۔ وہ بھی اپنی لالچ سے چھلانگ لگا کر کنارے پہنچ کر میرے تعاقب میں دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ اس نے پھل نارنج کی روشنی سے یہ جان لیا ہو گا کہ میں سالار ہوں۔ اب میرے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو رہی تھی۔

میرے پانی میں شرابو رہو نے کی وجہ سے ربوہ لور کی ساری گولیاں بھی بیگ کر بیکار ہو چکی تھیں۔ اب میرے پاس ایک خوفناک قسم کے چاقو کے سودا فاع کے لئے کچھ اور نہ تھا۔ میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر اس کا ٹخنہ دیا تو چاقو ٹھاک کی آواز کے ساتھ کھل گیا اور اندھیرے میں اس کا پھل چمکنے لگا۔ میں چاقو کے دسے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے سامنے والے درخت کی طرف بڑھا۔ اس کے تنے کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا پھر میں نے اپنے کان آواز کی سمت لگا دیئے۔

رات اور سنانے کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت قریب دوڑ رہا ہو۔ دوسرے لمحے میں نے پھر ایک اور آواز سنی یہ کسی اور کے دوڑنے کی آواز تھی۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک نہیں بلکہ دو آدمی بڑی تیزی سے اس طرح دوڑ رہے ہیں جیسے کوئی عفریت ان کے تعاقب میں ہو۔ وہ میری تلاش میں نہیں ہیں بلکہ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہیں۔

میں درخت کے پاس سے ایک قدم آگے بڑھا اور اس سمت کا اندازہ کرنے لگا جہاں سے ان کے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں دل میں حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس گھپ اندھیرے میں اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ آخر یہ بھاگ کر کہاں جا رہے ہیں اور کس لئے بھاگ رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جو بد معاش ہوں کسی کو لوٹ کر اور قتل کر کے بھاگ رہے ہوں۔ اس طرح سے دوڑنے کا انداز بتا رہا تھا ان دونوں نے ضرور کوئی نہ کوئی سنگین واردات کی ہے اس لئے سریت دوڑ رہے ہیں۔

پھر فضا میں ایک مرد کی آواز گونجی وہ اپنے ہوئے لمحے میں کہہ رہا تھا۔ ”میں کتا..... ہوں رک جاؤ..... ورنہ اچھا نہیں ہو گا..... میں..... میں..... تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“

معلوم نہیں وہ کس کو دھمکی دے رہا تھا۔ اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ وہ ہڈیاں لیجے میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دو

اللہ کہہ کر بائیں طرف پانی میں چھلانگ لگادی۔ میں پانی میں منہ کے بل گر اتو لڑکی طرح گھوم گیا۔ چند لمحوں کے بعد پانی کی سطح پر آیا۔ جیسی ان کی لالچ مجھ سے آگے نکل چکی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ مجھے پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے نہ دیکھ سکے تھے۔ میں پانی میں تیرتا ہوا کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆-----☆-----☆

مجھے دلش گاؤں، ندیوں اور تالوں کا ملک ہے۔ آپ بحری سفر کریں تو بڑا لطف آتا ہے۔ خاص کر آپ دھاکا سے کھانا جائیں تو اسے میں دو ایک دریا آتے ہیں۔ پھر سالار راستہ آپ ندیوں میں سے گزرتے ہیں۔ آپ ان ندیوں کو چھوئے چھوئے دریاؤں کا نام دے لیں۔ یہ ندیاں سو سے ہزار فٹ چوڑی ہوتی ہیں ایک طرح سے یہ پانی کی سڑکیں معلوم ہوتی ہیں ہندوؤں طرف قدم قدم پر آپ کو گاؤں ملیں گے۔ چھوئے چھوئے جزیرے نما گاؤں جو چاروں طرف سے پانیوں میں گھرے نظر آتے ہیں۔ کناروں پر مرد، بچے، لڑکیاں اور عورتیں آپ کو نہایت برتوں اور کپڑے دھوئی اور پانی بھرتی نظر آئیں گی۔ لوگ پھیلیاں پکڑتے بھی ملیں گے۔ راستوں میں کشیاں اور لٹائیں بھی چلتی اور آتی جاتی ملتی ہیں۔ آپ کو کسی نہ کسی طرف اونچے اونچے درخت اور کھیت دکھائی دیں گے۔

میراں بھی کوئی گاؤں ہو سکتا تھا۔ میں نے کنارے پہنچ کر اس سمت دیکھا جدھر کو لائیں گئی تھیں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ میں نے دو رستہ دو گولیاں چلنے کی آوازیں سیں۔ چند لمحوں کے بعد یہ آوازیں آہند ہو گئی تھیں۔ پھر مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ میرے پڑے پوری طرح پانی میں بیگ چپے تھے۔ سرد ہوا میں چل رہی تھیں اور میں کھلی جگہ پر تھا۔ آخر مجھ میں پہلے جیسے واقعہ سے دو چار ہوا تھا مجھے پناہ اور کپڑوں کی سخت ضرورت تھی۔ میراں دشمن کی موجودگی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں جیب سے پھل نارنج نکال کر اس کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ سریتانے یہ پھل نارنج میرے کپڑوں کو دھوئے اور اسڑی کرنے کے بعد قبض کی جیب میں رکھ دیا تھا۔

چاروں طرف گہری خاموشی اور تاریکی چھائی تھی۔ یہ گاؤں تھا کوئی چھوٹا شہر ہی ہوتا تو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ پر روشنی ہوتی۔ میں نے بمشکل نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دفعتاً کسی کے تیز دوڑنے کی آواز دگرے سکوت کا سینہ چرے لگی۔ میں ایک دم سے اچھل پڑا اور میں نے گھبرا کر فوراً ہی پھل نارنج بھجادی۔ میرے دل میں سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ..... کہیں میرے دشمن کا کوئی آدمی میرے تعاقب میں دوڑتا ہو

نہیں آئی تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تجھے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔“
”تُو نے مجھے ہاتھ لگایا تو تیرا سر پھاڑ دوں گی.....“ اس کا لہجہ نفرت اور غصے سے

کاپ رہا تھا۔ ”میں موم کی بنی ہوئی نہیں ہوں۔“
”اجھا.....“ وہ استہزائی انداز سے ہنسا۔ پھر ایک ہلکی سی آواز سنائی دی، مگر

جڑی کی آواز تھی میں کبھی نہیں سنا۔ ”یہ دیکھ رہی ہے میرے ہاتھ میں کیا ہے؟“
”تُو مجھے چاقو سے ڈرا رہا ہے گینڈے کی اولاد..... میں موت سے نہیں ڈرتی۔

اس جینے سے مر جانا ہر تر ہے۔“
میں اصل معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ ایک غیثت مراد یک معصوم اور جوان لڑکی

کی مجبور رہے فائدہ اٹھا کر اسے شکار کرنے پر حلا ہو تھا۔ اس دنیا میں ایسے شکاریوں کی
کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک لڑکی درندے کے سامنے اپنی عزت بچانے کے لئے ذنی ہوئی

تھی۔
میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر بڑے زور سے دھک دی۔ گھر کے اندر ایک دم

سے سنا تھا کچھ ایک مرد جس کا نام کلا فشی تھا اس کی تیز دند آواز گونجی تو وہ مر قش سی تھی۔
”کون.....؟ کون ہے؟“

”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔“ میں نے کرفت لیے جواب دیا۔ ”فور دروازہ
کھولو.....“

”کون پولیس انسپکٹر.....؟“ کلا فشی کی آواز سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ”تم
کمال سے آگئے۔ اس گاؤں میں کوئی پولیس افسر نہیں رہتا۔“

”میں ڈھاکا سے آیا ہوں تحقیقات کرنے کے لئے.....“ میں نے اس پر رعب
ڈالا۔ ”گاؤں والوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔“

”میں کسی پولیس انسپکٹر ویکٹر کو نہیں جانتا۔“ وہ شیر ہو گیا۔ ”میں رات کے وقت
اپنے باپ سے بھی نہیں ملتا مگر صبح آ جانا.....“

میں اس کی ڈھٹائی پر حیران ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ کیا بلکہ گاؤں کے بد معاش بھی
پولیس کے نام سے گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ یہ تو کوئی چمنا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔

اس کے جواب نے مجھے کھولا دیا۔
”دروازہ کھولے ہو کہ نہیں غیثت آدمی.....“ میں نے دروازہ پینے ہوئے

کہنے..... ذلیل..... میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ارٹ
تھو.....“ اس نے شاید مرد کے منہ پر تھوک دیا۔

”تُو کیسے نہیں جائے گی..... میں نے تیری ماں کو ناکا دیے ہیں۔ اب تُو میری
ہے.....“ مرد سخت لیے میں بولا۔

پھر میں نے لڑکی کی آواز میں سنیں۔ وہ چیخ چیخ کر ساتھ جانے سے انکار کر رہی تھی۔
اسے گالیاں دے رہی تھی۔ مرد نے شاید اسے گمرو میں اٹھایا تھا یا پھر اسے کھینچتا ہوا ساتھ

لے جا رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد اس کی آواز دور ہو کر سنانے ڈوب کر رہ گئی۔
ایک بات میری سمجھ میں جو آئی وہ یہ تھی کہ اس لڑکی کو اس کی ماں نے ایک رقم کے

عوض شادی کے لئے بیچ دیا ہو گا۔ وہ اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو گا۔ لڑکی کو یہ مرد پسند
نہیں آیا ہو گا۔ وہ کوئی بوزھا اور رعیش قسم کا مرد ہو گا اس لئے لڑکی اس سے شادی کر:

نہیں چاہتی ہو گی اور اس لئے بھاگ کر کہیں جا رہی ہو گی۔ اس مرد نے تعاقب کر کے اسے
پکڑ لیا اور اب اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

میں نے چاقو بند کر کے جب میں رکھ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔ اس لئے
کہ کپڑے بدن سے پچکے ہوئے تھے اور سردی بھی لگ رہی تھی۔ کوئی پند رہا میں منٹ چلنے

کے بعد مجھے ایک مکان نظر آیا جو الٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس مکان میں سے تیز تیز باتیں
کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میری مانچ کی روشنی نے مجھے اس مکان کے دروازے پر

جا کھڑا کیا۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا۔
”میں مر جاؤں گی..... خود کشی کر لوں گی..... تیرے ساتھ نہیں چلوں گی“

..... تیری بات نہیں مانوں گی۔“ یہ آواز اس لڑکی کی تھی جو میں نے کچھ دیر پہلے سنی
تھی۔ لڑکی کی آواز تیز و تند تھی۔ وہ نفرت اور غصے سے کہہ رہی تھی۔ ”میں تیرا خون پی

جاؤں گی۔“
وہ مرد ہنسنے لگا۔ ”تُو مجھ میں کتنی پیاری لگتی ہے..... اسی لئے تو میں نے تیری

ماں کو ابھی رقم دی ہے۔ میرا نام کلا فشی ہے۔ بڑے بڑے بد معاش میرے نام سے کاپتے
ہیں..... تُو کیا میرا خون پئے گی۔“

”میں کتنی بوس ڈھٹ جا میرے راستے سے.....“ وہ ہڈیانی انداز سے بولی۔
”دیکھ نیلو کی بیٹی.....“ مرد کسی کتے کی مانند غرا ہوا تھا۔ ”تُو نے ایک گھٹنے سے

میری جان عذاب کر رکھی ہے۔ اچھی طرح سے سن لے اگر تُو سیدھی طرح راہ راست پر

”نہیں.....“ اس نے بھی بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”تمہارا پ بھی آجائے تو دروازہ نہیں کھولوں گا۔“ میں نے پھل نارچ سے دروازے پر روشنی ڈالی۔ دروازہ اس قدر مضبوط نہیں تھا پہلے تو میں نے دروازے پر ایک لات رسید کی۔ دروازہ ہل کر رہ گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایک زوردار دھکے کی ضرورت ہے۔ میں دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ بھانکا ہوا آیا اور گندھے سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ اپنے قبضوں سمیت فرش پر آ رہا..... میں نے اپنا توازن برقرار رکھا۔ میں توازن برقرار نہ رکھتا تو دروازے سمیت فرش پر آ رہا۔

کمرے میں ایک بہت بڑی لائین جل رہی تھی۔ اس کی تیز روشنی کمرے میں بھیلی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے میری نظریں ایک جوان لڑکی پر پڑیں جس کی عمر بشل پندرہ سولہ برس کی ہو گی۔ وہ ایک حسین اور بھرپور لڑکی تھی اور مجھے حوش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ دو بار اسے کسمی اور پریشان کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر روشنی آ گئی۔ میں بمکت کلر کے سفاری سوٹ میں بلوس تھا اس لئے اس نے مجھے پولیس انسپکٹر سمجھ لیا تھا۔ وہ میری طرف لپک کر آئی۔ ”انسپکٹر صاحب! مجھے اس شیطان سے بچا لیجئے..... یہ مجھے زبردستی گھر سے اٹھا کر لایا ہے۔“ وہ گونگڑا لے گئی۔

”بہ جھوٹ کہتی ہے۔“ مرد بڑا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمبا ترنگا اور مضبوط جسم کا آدمی تھا بنگالیوں میں ایسے لمبے قد کے مرد ہزاروں میں ایک دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سوراہی تھیں۔ ان سے خباثت بھانکا رہی تھی اور چہرے پر سفاکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے میں ایک نمبر کینہ اور غیبت لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا سا چھرا تھا۔

”جھوٹ تم بول رہے ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”تمہیں شرم نہیں آئی ایک غریب لڑکی کو اس کے گھر سے اٹھا کر لاتے ہوئے۔“

”اس کی ماں کو میں نے سوٹا کا دے کر اسے خرید لیا ہے۔“

”سوٹا.....؟“ میرے اندر نفرت اٹھ اٹھی اور دھکے کا ایک رٹا اٹھا۔ ”ایک انسان کی قیمت صرف سوٹا..... کیا یہ لڑکی صرف سوٹا کی ہے۔“

”انسپکٹر صاحب!“ وہ تنہا سے بولا۔ ”سوٹا کا میں نے بھر بھی بہت دینے ہیں۔ یہاں انسان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ انسان تو جانور سے بھی سستا ہے۔“

”یہ تم جیسے کتوں کے نزدیک انسان جانوروں سے بھی سستا ہو گا۔“ میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ پھر میں نے لڑکی کی طرف گھوم کر پوچھا۔ ”جج جج جج..... کیا اس نے تمہاری ماں سے تمہیں سوٹا کا میں خریدا ہے۔“

اس لڑکی نے اپنا سر اور اپنی نظریں نیچی کر کے سر ہلایا۔ ”جی انسپکٹر صاحب! یہ کاشاشی ٹھیک کہتا ہے۔“

میں نے اپنی جیب سے بڑھ نکال کر اس میں سوٹا کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ لو سوٹا..... اسے اپنے گھر جانے دو.....“

”مگر میں تو اسے سوٹا کا میں نہیں بچ رہا ہوں۔“ اس نے میرے ہاتھ سے نوٹ نہیں لیا۔ ”اب یہ میرا مال ہے اب میری مرضی اس بیٹوں یا نہ بیٹوں۔“

”یہ کوئی جانور نہیں ہے یہ ایک شریف لڑکی ہے۔“ مجھے اس کا جواب سن کر غصہ آ گیا۔

”یہ جو جی ہے میری ملکیت ہے آپ مجھے اسے سوٹا کا میں بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“ وہ اکر آ جا ہوا تھا۔

”تمہیں اس کی کتنی قیمت چاہئے؟ سو دو سو تین سو چار سوٹا.....“ میں اپنے بڑے سے سوٹا کا کے نوٹ نکال لے گا۔

”میں تو صاحب اسے دس ہزار سوٹا کا میں بھی نہیں بیچوں گا۔ آپ اپنی راہ لیں مجھے پولیس انسپکٹر بن کر ڈرائیں دھمکائیں نہیں۔“

”اسے تم کیوں نہیں بیچو گے.....؟“ میری رگوں میں لہو اٹھنے لگا۔ میں نے جیب میں بڑھ کر اسے گھورا۔

”اس لئے کہ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اسے کراچی لے جاؤں گا۔ وہاں دس پندرہ ہزار سوٹا کا میں بیچوں گا۔ بیچنے سے پہلے دس پندرہ ہزار کا قاعدہ بھی اٹھاؤں گا..... یہ میرا ہے ہیرا..... اس کی مجھے بہت اچھی قیمت ملے گی۔“

”اب تمہیں سوٹا کا تو کیا ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی..... میں اس لڑکی کو اس کے گھر لے جا رہا ہوں تم میرا رستہ روک سکتے ہو تو روک لو.....“

”کیوں اس لڑکی کے پیچھے آپ اپنی موت کو دعوت دے رہے ہیں..... شاید آپ مجھے نہیں جانتے ہیں؟ میرا نام کاشاشی ہے۔ میرے نام کا ڈنکا صرف اس علاقے میں ہی نہیں کھانے لے کر نکلتا ہے جتا ہے۔ بڑے بڑے بد معاش میرا نام سن کر قہر جاتے

قوت سے میرا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا۔ میرا دم تھا کہ گھٹنا جا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اچانک اس نے میرا گلا چھوڑ دیا۔ ایک دلدوز بیچ مار کے وہ لڑکی کی طرف چلا۔ اس لڑکی نے میری جان بچائی تھی۔ اس نے کمرے میں رنگے ایک کپڑے کو اٹھا کر اس کے کندھے پر دے مارا تھا۔ وہ درودی تاب نہ لاسکا اور میری گردن چھوڑ دی تھی۔

وہ لڑکی کے پاس جا کر ڈنڈا چھیننے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے لپک کر اسے پیچھے سے اپنے بازوؤں کے شیعے میں کس لیا۔ اب ہم دونوں میں ایک ایسی کشمکش شروع ہو گئی تھی جو کسی ایک کی موت پر ختم ہو سکتی تھی۔ لڑکی نے وہ ڈنڈا اٹھا لیا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اس نے ڈنڈا اٹھا کر اتنے زور سے کلاشی کی ٹانگ پر دے مارا کہ درد و اذیت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”نیلو! تم ایک طرف ہو جاؤ۔“ اس کتے کے بچے سے میں خوبی منٹ لوں گا۔ اسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ یہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔“

نیلو تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر ایک طرف ہو گئی تو میں نے اسے برقی رفتار سے اپنے بازوؤں کی قید سے الگ کیا اور بغیر کسی تاخیر کے اسے تنے زور سے دیوار کی طرف دھکا دیا کہ وہ کسی سنسناتی ہوئی گولی کی طرح دیوار سے جھٹکرایا۔ اس کا سارا جسم ہی نہیں بیجا بھی بل کر رہ گیا ہو گا۔ وہ ایک گینڈے کی طرح تھا اس لئے وہ اتنی بڑی چوٹ سہہ گیا اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سنبھل کر سرعت سے میری طرف گھوما تو میں نے دیکھا اس کی ٹانگ اور منہ سے خون نکل رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح سنبھلا اور مجھ پر بل پڑتا میں نے اس کی کینٹی پر جوڑو کے دو تین ہاتھ مارے وہ جیسے ہی فرش پر کسی کئے ہوئے شیتیر کی طرح گر ایں نے ہاتھوں سے اس کی خاطر پوشی کرنا شروع کر دی۔ جب اس نے اپنے آپ کو بے کس اور میرے رحم و کرم پر بایا تو گڑباز نہ لگا۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑے اور خوشامدیں کہیں تو میں نے اسے بخش دیا اس لئے کہ میں نے اس کی جو درگت بنائی تھی وہ اس کے لئے بہت کافی تھی۔ وہ وہ ایک دن تک چلے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور پھر وہ نہ صرف بری طرح کراہ بھی رہا تھا بلکہ اس کی ٹانگ اور منہ سے خون کی دھاریں برہم رہی تھیں۔

میں ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا میں نے دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اٹھایا تاکہ اسے دیوار سے لگا کر کھڑا کر دوں میں نے دروازے کو کھڑا کیا یہی تھا کہ

ہیں۔ پولیس والے میرے آگے پیچھے کتوں کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں آپ بھلا کیا چیز ہیں.....؟“

کاش! تم نے بھی میرا نام سنا ہو..... میں تیسرے درجے کے کینوں کو منہ نہیں لگاتا ہوں۔“ میں نے پلٹ کر لڑکی کا بازو پکڑا۔ ”چلو نیلو..... میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں.....“

غیر جاؤ.....“ وہ اپنی پوری قوت سے دھاڑا۔ وہ چھرا لہراتا ہوا نظروں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا تم نے مجھے پتہ سمجھ رکھا ہے؟“

میں اس کے تپلے کا شہر تھا۔ کلاشی سے مقابلہ آسان نہیں تھا وہ ایک چھٹا ہوا بد معاش تھا۔ جس انداز سے اس نے ہاتھ میں چھرا پکڑ رکھا تھا اس سے اس کی مشافی کپا چلا تھا۔ یہ ایک ظالم شخص تھا۔ اس حیثیت سے شکست کھانے کا مطلب یہ تھا کہ میں زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ میری طرف جس تیزی سے چھرا فضا میں لہراتا ہوا چھٹا میں اس سے کہیں تیزی کے ساتھ ایک طرف ہٹ گیا اور دریاں ہاتھ سے ایک گھونسا اس کی پٹلی میں مارا تو دوسرے لمحے وہ فرش پر خاک چاٹ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پٹلی میں جوتے سے ایک ٹھوک لگائی تو وہ دروسے بلبل کر ہرا ہوا گیا لیکن سرعت سے کھڑا ہو گیا۔ فیسے اور درودی شدت سے اس کا پھر لاہر لگا۔ مجبوراً کاہو رہا تھا۔ اس نے چھرا میری طرف پھینکا۔ اگر میں تیزی سے جھک نہیں جاتا تو وہ چھرا میرے سینے میں دلی کی جگہ کڑی کمان سے ٹٹکے ہوئے تیر کی مانند جوت ہو جاتا۔ اس کا اور خالی جو گیا تو اسے اور غصہ آ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور اب نیتے تھے۔ اب میری باری تھی۔ جب سے چاقو نکالنے کی، میں یوں تو دیوار پر بھی نکل کر اسے قابو میں کر سکتا تھا مگر اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میں اس کی ایسی درگت بنانا چاہتا تھا کہ وہ تین دن تک بستر سے نہ اٹھ سکے اور پھر کسی لڑکی کو خریدنے کی ہمت نہ کرے۔ وہ مجھے اپنی سوز آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہ آہیں نہیں ٹانگ کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے تیور بڑے خطرناک تھے۔

وہ غرا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی حالت چوٹ کھانے ٹانگ کی سی تھی۔ اس پر جنون سا سوار تھا اس لئے پوری طرح اپنے اوسان میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ میرے منہ پر پڑتا میں نے اس کی ٹانگ پر ایک گھونسا چڑیا۔ وہ ایک دم مجھ سے چپٹ گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑ کے دبانے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور وہ اپنی پوری

نیلو نے ایک دم سے بڑے زور کی چیخ ماری۔ ”انپکڑ صاحب!..... بچتے..... بچتے۔“

میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر اترتی چلی گئی۔ وہ غیث چھرا لے کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چھرا کے کا خیال نہیں کیا۔ چھرا اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ میرا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا تھا کہ وہ بٹنے بٹنے کے قابل نہیں رہا۔ اگلے درجے میں اندازہ ہو تا کہ وہ اتنا تخت جان ہو گا تو میں اس کی اور مرست کر دیتا۔ اس کے سر پر جیسے انتقام کا جنون سوار ہو گیا تھا اور وہ اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے میرے چھرا گھونپنے کے لئے آ رہا تھا۔ اگر وہ دردناکیت سے بے جان سائیں ہو رہا ہو تا تو اب تک مجھ پر ہتھیار فحاشی سے حملہ آور ہو چکا ہو تا اور وہ چھرا میرے جسم میں اتر جاتا۔ میں نے دردناکے کو جلدی سے فرش پر گرادیا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی اور اس نے مجھے جیسے گھیر لیا تھا۔ مجھے اس نے منٹیلے اور بچاؤ کی مصلحت بھی نہیں دی۔ میرے سینے پر اپنے خوفناک چھرا کی نوک رکھ دی تو میں دو اور دستے لگ کر کھڑ ہو گیا۔

اب میں بے بس اور اس کے رحم و کرم پر تھا۔ ساری بازی الٹ چکی تھی مجھے اپنی نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی صورت میں مجھ بیٹھے سے رہا تھا۔ اس کی لال لال آنکھوں میں دردناک تر آئی تھی اور چہرے پر سفاکی تھی۔ میں اپنی جگہ سے جنبش بھی کر تا تو چھرا کی نوک میرے سینے میں اتر جاتی۔ چھرا کی نوک کی چھبیں سے میرے سینے میں تکلیف ہو رہی تھی میں اسے چھرا ہٹانے کے لئے کہ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھی تو وہ اور بچھو تا۔ میں تکلیف برداشت کئے خاموشی سے کھڑا رہا۔

”اب کو پانی کی اولاد.....“ اس کی سانس اس کے سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اس کا چہرہ اور آنکھیں کسی جلاد کی طرح دکھ رہی تھیں۔ ”تم نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہی تھی۔ اب میں تمہاری جان لوں گا میں اس چھرا سے اب تک تم جیسے ہر دی کر نے والے کئی لوگوں کو اس دینا سے رخصت کر چکا ہوں۔“

”گر تم سے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچاؤ یا درکھو..... تم خود بھی بچ نہیں سکو گے.....“ میں نے نفیاتی حربہ آزمائے کی کو مشق کی۔ اس لئے میرے پاس وقار کے لئے ایک ہی ہتھیار تھا۔ اس سے میری جان بھی بچ سکتی تھی۔

”میں کیسے بچ نہیں سکوں گا.....“ اس نے مجھے گھورا۔ ”کیا تمہارے فرشتے مجھ سے تمہاری موت کا بدلہ لیں گے۔“

”فرشتے نہیں پولیس.....“ یہ دھمکی میرے لئے دلدل میں جگے کا سہارا تھی۔ ”میں پولیس کا آدمی ہوں پولیس کے آدمی پر حملہ کرنا یا اسے قتل کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ پولیس تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گی.....“

”میں جانتا ہوں کہ تم پولیس والے نہیں ہو اور مجھے خواہ خواہ ڈرا رہے ہو۔“ وہ حقارت سے بولا۔ ”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم پولیس کے آدمی ہو۔“

”میں ان کے ہاتھ والوں سے تمہیں ثبوت مل جائے گا۔ تم کسی بھی پولیس والے سے پوچھ کر دیکھ لو۔“

”تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو میں خود پولیس میں دس بارہ برس ملازم رہ چکا ہوں۔“ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرا گردن پکڑ لیا۔ ”تمہارے کیلے کپڑے بنا رہے ہیں کہ تم کوئی بزم ہو یا سنیو لالاج سے پانی کی شکر کو در اہرانی جان بچانے آ گئے ہو۔“ وہ اپنا ہاتھ میرے والا ہاتھ پیچھے سے لگیا تاکہ میرے سینے میں چھرا گھونپ سکے لیکن پھر اس کا ہاتھ حرکت نہ کر سکا میرے گردن پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر اس کے ہاتھ سے چھرا پھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ لاٹھیاں اٹھاتا ہوا پھرتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گردتے نیلو پوری قوت سے اس کے ہاتھ بیروں پر پڑنے سے خرابی لگنے لگی یہ نیلو تھی جس نے میں وقت پر کھلا فٹکی کے سر پر ڈنڈا دے کر اسے مارا تھا۔ اگر اس سے ایک پل کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری انٹرنل باہر آچکی ہو تیں۔

میں نے لپک کر نیلو کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا۔ اس پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا اس نے نہ صرف لالاشنی کا سر پھاڑ دیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ ہر کی ہڈیاں بھی توڑ کے رکھ دی تھیں وہ اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی پکڑ کر دینا چاہتا تھا وہ میرے ہاتھ سے ڈنڈا چھیننے لگی۔ ”انپکڑ صاحب! مجھے یہ ڈنڈا دے دیں..... میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دیتا ہوں تاکہ یہ کسی لڑکی کو خرید نہ سکے۔ اسے لے کر نہ جاسکے۔“

”تم نے اس کا سر پھاڑ دیا ہے ہو سکتا ہے اب وہ زندہ نہ بچ سکے..... چلو.....“

”میں اس کی بھی سر پہ کے وہ اڑیاں گڑ کر مر جائے.....“

”یہ مر جائے گا.....“ نیلو کا چہرہ دکھ اٹھا۔ ”خدا کرے یہ مر جائے یہ کینہ ہمارے گاؤں کی بہت ساری لڑکیوں کو خرید کر پاکستان میں بیچ آیا ہے۔ ان لڑکیوں کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان لڑکیوں کی مائیں اس کی موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ آج ان کی دعائیں قبول ہو گئیں۔“

ہم دونوں اس جگہ سے نکل کر ایک بگڑی ہوئی چلتے گئے۔ میں نے نیلو سے کہا۔ ”تم نے آج میری دو مرتبہ جان بچائی..... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا گا..... تمہیں بیشہ یاد رکھوں گا۔“

”آپ تو میرے لئے فرشتہ ثابت ہوئے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”خدا نے آپ کو میرے لئے فرشتہ بنا کر بھیجا۔ آپ نہ آتے تو میرے پاس کچھ بھی نہ ہوتا آپ نے میری خاطر اپنی جان تک خطرے میں ڈال دی۔ میں سو مرتبہ بھی آپ کی جان بچاؤں تو آپ کا یہ احسان نہ اترے۔“

یہ ایک دیرپائی اور معصوم لڑکی تھی لیکن اس کی باتیں بڑی گہری تھیں۔ وہ اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑے اپنے گھر کی طرف چلتی رہی کوئی مینٹ کی مسافت کے بعد نیلو کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو اس کی ماں جاگ رہی تھی اور اپنے غصیوں کو رو رہی تھی۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجائی تھیں۔ وہ مجھے نیلو کے ساتھ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی اور اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا کلاشٹی نے تمہیں ان کے ہاتھ بچ دیا ہے۔“

”نہیں ماں.....“ وہ ماں کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔ ”یہ انیسٹر صاحب

ہیں انہوں نے نہ صرف میری عزت بچائی ہے بلکہ نئی زندگی دی ہے۔“ نیلو نے اپنی ماں کو مختصر طور پر سارے حالات سے آگاہ کیا۔ پھر اس نے ایک کپڑوں کی گھڑی میں سے ایک مردانہ جوڑا نکال کر مجھے پہننے کے لئے دیا۔ اس کا ایک بھائی تھا جو اپنی شادی کے بعد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ڈھاکہ شہر چلا گیا تھا۔ تب سے وہ وہیں تھا اور اس نے کبھی بھول کر اپنی ماں اور بہن کی کوئی خبر نہیں لی تھی اور نہ ہی ان کے اخراجات کے لئے کوئی رقم روانہ کی تھی اس روز سے ماں اپنی محسرت اور غمگینی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ فاقوں کی نوبت تک آگئی تھی۔ کلاشٹی کراچی میں لڑکیوں اور جوان عورتوں کو ملازمت دلوانے کے بہانے خرید کر یا سبز باغ دکھا کر لے جاتا تھا۔ یہ لڑکیاں اور عورتیں اس لئے چلی جاتی تھیں کہ وہ غریب باپے سارا ہوتی تھیں اور انہیں ایک وقت بھی کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ نیلو کی ماں نے بھی مفلسی غمگینی سے تنگ آ کر اپنی بیٹی کو اس غیبت کے ہاتھ کو سامنے بیچ دیا تھا کہ کم از کم اس کی بیٹی بھوک تو نہیں رہے گی کہیں بھی جائے گی، کسی حال میں بھی رہے گی اسے دو وقت پیٹ بھر کے کھانے کو تو مل جائے گا۔ نیلو کو ایک ماں نے نہیں بیچا تھا غربت و افلاس اور اس کی مجبوری نے بیچا تھا۔ یہ سودا نیلو کی مرضی کے خلاف ہوا تھا اور وہ کسی قیمت پر کلاشٹی کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ کلاشٹی اسے زبردستی ساتھ لے گیا تھا۔ نیلو کی ماں نے بہ ساری

الم ناک گمانی تانے کے بعد کہاکہ وہ دونوں آج بھی صبح سے فاقے سے ہیں۔

اس وقت گھر میں کچھ نہ تھا۔ نیلو کی ماں سوٹا کا وہ نوٹ لے کر جو کلاشٹی نے نیلو کے عوض دیا تھا سودی (پرچون کی دکان کی دکان والے سے چائے کی پتی اور شکر خرید کر لانے چلی گئی تھی وہ دیر کے بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ اور بکٹ بھی تھے نیلو نے چائے بنائی۔ میں نے صرف چائے پی کر اپنی بیٹی نے سارے بکٹ ختم کر دیئے۔ میں نے نہیں بہت مختصر طور پر یہ بتایا کہ مجھے کچھ بد معاشر نے جان سے مارنے کی کوشش کی تو میں نے پانی میں چھانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ نیلو کی ماں نے بتایا کہ صرف پیر کی رات آٹھ بجے ایک لانچ آئی ہے جو چاند پور سے روانہ ہوئی ہے اور یہاں اناج وغیرہ اتار کر ڈھاکہ چلی جاتی ہے۔ پہلے یہاں دن اور رات کو کچھ سات لائیں آتی تھیں اب دن میں صرف دو لائیں آتی ہیں اس لئے کہ اکثر لائیں جو اناج اور غلے کی ہوتی ہیں، دو ایک دن کے لئے پراسرار طور پر لاپتہ ہو جاتی ہیں پھر وہ خالی ہوتی ہیں ان میں نہ تو آدی ہوتے ہیں نہ فلفہ ہوتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جنت آدمیوں اور اناج کو غائب کر دیتے ہیں اور کسی جزیرے پر جنت کا بئیرا ہے وہ یہ حرکت کرتے ہیں۔ اس وجہ سے سارے گاؤں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اور طرح طرح کے قصے کہانیاں مشہور تھیں۔ اتفاق سے آج اتوار کا دن تھا۔

نیلو نے میرے لئے ایک کمرے میں بستر لگا دیا۔ وہ دونوں دوسرے کمرے میں جا کر سو گئیں۔ میں ساری رات بڑے آرام سے سویا۔ صبح مجھے نیلو نے جگا یا میں نے ان دونوں کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی کو بھی میرے بارے میں ہوا تک نہ لگتے دیں۔ پھر میں نے نیلو کی ماں کو دو سوٹا ٹاڈیئے تاکہ وہ ناشتہ اور سارے دن کے لئے کھانے کا بندوبست کرے۔ وہ جا کر راشن، مچھلی اور دو مرغیاں، دو دھنسی اناجے اور مٹھائی بھی لیتی آئی۔

ماں بیٹی نے مل کر جلدی سے پُر تکلف ناشتہ تیار کر لیا تو پراٹھے سوچی کالوہ اور دھنسی دو سوٹا غریب اس ناشتہ پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ دوسرے کھانے میں مچھلی کا سالن بھات اور فرائی مچھلی بھی تھی۔ سالن برا مزیدار اور ذائقہ دار تھا۔ میں نے شام تک کا وقت ان سے باتیں کر کے اور چائے پیتے ہوئے گزارا۔ رات کے کھانے کے لئے وہ دونوں مرغیاں ذبح کر دیا جانتی تھیں۔ میں نے منع کیا صرف ایک مرغی ذبح کی سات بجے رات کا کھانا تیار تھا نیلو نے مرغی بلاؤ پکا یا تھا جو بہت عمدہ تھا۔

ساڑھے سات بجے لانچ کے سامان کی آواز سنائی دی نیلو نے بتایا کہ وہ آدھے گھنٹے تک سامان اتارنے کے لئے رکتی ہے۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے اور جب سے بڑا نکالا یہ

بڑا جعفر کا تھا اس میں چھ ہزار لاکھ کی رقم تھی۔ میں نے اس میں سے چار ہزار لاکھ کی رقم نکال کر ان کی طرف بڑھا دی تو ان بیٹی نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ غریب تھیں لیکن ان کا دل بڑا تھا اور خوبصورت بھی تھا۔ میرے بہت مجبور کرنے پر انہوں نے رقم لے لی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اس رقم سے گاؤں میں کوئی کاروبار کر لیں۔

وہ دونوں مجھے رخصت کرنے لکھا تے ڈرافٹس لے کر آئیں اور ایسے راستے سے لے گئی تھیں کہ کسی کی بھہ پر نظر نہ پڑ سکے۔ نیلے راستے میں بتایا تھا کہ سہ پہر کے وقت کلاشکی کا ایک آدمی اس کے ہاں گیا تو وہ بے ہوش پڑا تھا اسے بے ہوشی کی حالت میں کشتی میں ڈال کر نروپہ رلے جایا گیا جہاں ایک سرکاری ڈپنری واقع ہے دیسے اب کالا کشتی کا ہوش میں آنا مشکل تھا۔

لاچ کی روائی گئی مین جابج بچ سات منٹ باقی رہے تو میں نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ نیلو توبت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی اور ساڑھی کے پلو میں سہ چھپا کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس سے میرا ایک گرام اور جذباتی سارشتہ ہو گیا تھا جو تمام رشتوں پر ہماری تھا۔ اس رشتے کی پاکیزگی نے اس سے قریب کر دیا تھا۔ میں نے نیلے کے آنسوؤں کو پوچھا اور اس کے سر پر شفقت سے اس طرح سے ہاتھ بھیرا جیسے وہ کوئی میری چھوٹی بہن ہو۔ پھر میں تیزی سے لاچ کی طرف لپک گیا اس وقت بیڑی نکالنے کی تیاری کی جارہی تھی۔ میرے عرشے پر قدم رکھتے ہی بیڑی ہٹا دی گئی۔ گھاٹ پر موجود گاؤں کے باشندوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اس لئے کہ میں ان لوگوں کے لئے اجنبی تھا اور گاؤں والوں کو شاید اس لئے بھی تعجب ہو رہا ہو گا کہ میں انہیں دن میں دکھائی نہیں دیا تھا۔

جب لاچ روانہ ہوئی تو میں عرشے پر تھوڑی دیر تک کھڑا اس گاؤں کی طرف اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس گاؤں سے میری کچھ یادیں وابستہ ہو گئی تھیں۔ نیلے میرے دل پر گہرا نقش چھوڑا تھا میں اسے ساری زندگی بھول نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف میری محسن تھی بلکہ ایک مہادور اور عظیم لڑکی بھی تھی جس نے بھوک، غربت و افلاس اور حالات کے سامنے کھٹے کھٹے کے بجائے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ اس دیش میں کیا ساری دنیا میں بہت کم غریب اور فائدہ زدہ لڑکیاں اور عورتیں حالات سے لڑتی تھیں اور وہ مجبور دیوں کا شکار ہو جاتی تھیں۔ سب سے عظیم بات بھوک سے لڑنا تھا۔

یہ کارگو لاچ تھی اس پر راشن کی بہت ساری بوئیاں لدی ہوئی تھیں۔ لاچ کے ایک ملازم نے بتایا کہ یہ راشن دو ایک گاؤں میں اتار کے ڈھاکا جائیں گے۔ اس لاچ میں مسافروں کے لئے عرشے پر ایک کمرہ سہا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کوئی آٹھ دس مسافر بھی تھے۔ ان میں دو جوان لڑکیاں اور ایک عورت تھی۔ یہ سارے مسافر کسی گاؤں کے تھے جو راستے میں پڑا تھا۔

لاچ میں ایک چھوٹا سا ریٹورنٹ بھی تھا۔ میں نے اپنے اوپر دم سفروں کے لئے چائے منگوائی۔ ان لوگوں نے بڑی مہربانی سے میری چائے قبول کر لی اور سیاست کے موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ چائے پینے کے تھوڑی دیر کے بعد میں نے ایک آواز سی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ کسی لاچ یا اسٹیر کے انجن کی آواز سی گئی۔ میں عرشے پر آیا تو میں نے ایک تیز رفتار لاچ کو مخالف سمت سے آتے دیکھا۔ کیا کروں میری سمجھ میں نہیں آیا اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ ہماری لاچ کو روک کر اس کی تلاش لیں گے۔ اس کی تلاش لینے کا مقصد مجھے بے زیاں پر کرنا تھا پھر اس لاچ کو اغوا کر کے لے جانا بھی ہو سکتا تھا۔ اب تو فراہ کی راہ بھی نہیں رہی تھی اس لئے کہ وہ لاچ قریب ہوئی جارہی تھی اور اس کی رفتار میں بھی کمی ہوئے لگی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر لاچ کو روکنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو میں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو انجن کی ان بوئیوں کے درمیان جو عرشے پر رکھی تھیں چھپا لیا یہاں ایک بہت بڑا خلا تھا۔ میں نے ایک بوئی کو اس طرح کھسکا کہ ادھر روشنی پڑنے پر بھی میں نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ بوئیاں لاچ کے عقبی سرے پر رکھی تھیں اور ادھر گھپ اندھیرا بھی تھا۔ اس طرح میں سب کی نظروں سے پوری طرح محفوظ ہو گیا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ لاچ کے رکستے ہی اس لاچ سے شاید چھ سات مسلح افراد ہماری اس لاچ پر آگئے۔ ان کی آوازوں اور باتوں سے پتہ چل گیا کہ انہوں نے نہ صرف اس لاچ پر قبضہ کر لیا بلکہ اس لاچ پر سوار تمام مسافروں اور عملے کو نیچے لے جا کر قید کر دیا تھا۔ عورتوں نے چیخا پلانا شروع کیا تو نہیں ڈانڈا درجان سے مارنے کی دھمکی دینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لاچ نے دشمن کی لاچ کے پیچھے پیچھے اپنا سفر شروع کر دیا۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دو مسلح معاش ان بوئیوں کے ڈھیرے کے پاس آکر جہاں میں لیٹا تھا چاول کی ایک بوئی پر بیٹھ گئے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے قہر آمیز لہجے میں کہا۔

”شامو! یہ سلاسلار کہاں غائب ہو گیا؟ ہم نے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا۔ دو دنوں استیمبروں اور لڑائیوں کی بھی تلاشی لی۔ وہ اور اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گئے۔“

”آج تک ہمیں اور ہمارے پاس کو ایسے ذہن اور چالاک دشمن سے واسطہ نہیں پڑا..... کیوں؟“ دوسرے نے کہا۔ ”یہ سلاسلار ہے جو نہ صرف فرار ہوا بلکہ اس نے ہمارے ایک اڑے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ وہاں قیدی لوگوں کو بھی لے گیا اور دو آدمیوں کو قتل بھی کر دیا۔“

”اسی لئے تو ہمارے پاس کاموڈ آج بہت خراب ہے۔ اسے خوف پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں سلاسلار جزیرے کا پتہ نہ چلائے۔“

”ہاں! لئے کل سب سے کہا ہے کہ سلاسلار کو ہر قیمت پر گرفتار یا اغوا کر کے لایا جائے! ڈاکٹر دت بہت خدا کو بھی..... اس لالچ میں جعفر کی لاش اور سلاسلار کے سوا کوئی اور نہ تھا میرا خیال ہے سلاسلار نے دوسرے لوگوں کو اس استیمبر میں سوار کر دیا ہو گا۔“

”ہاں آج کے ہمارے اس کارنامے سے شاید بہت خوش ہو گا۔ بہت دنوں کے بعد ہم نے ہنگامہ کھار کیا ہے۔“

”کون سا ہنگامہ کھار.....؟“ اس کے لیے میں حیرت تھی۔

”یہ لالچ اور کون سا شکار.....؟“ اس کے سامنے نے کہا۔ ”جانتے ہو اس میں دال بھات کی بجائے اس سے زائد ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت مسلمان بھی ہے۔ بکمرے اور مرغیاں بھی ہیں، خادم نے چار مرغیاں ذبح کر دی ہیں تاکہ انہیں فروانی کیا جا سکے۔“

وہ دونوں لالچ کے سامان اپنے پاس اور میرے کارنامے کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ مجھے ان کی موجودگی سے بڑی دشت سی ہو رہی تھی۔ میرا پس چلتا تو ان دونوں کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیتا یا ان کے سر پر کسی سخت چیز کی ضربیں لگا کر بے ہوش کر دیتا۔ توڑی دیر کے بعد میں نے ایک آواز سنی ہوئی دوسرے انہیں پکار کے کہہ رہا تھا اور آکر جانے لے لیں۔ وہ دونوں اس کی آواز سن کر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تو میں نے اطمینان کا کمراساں لیا۔ اس لئے بھی کہ مجھے چھپک آجاتی یا کھائی اٹھ جاتی تو میں دھڑلے جاتا۔ ان کے پہرے نے مجھے ایک کرناک اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک طرح مجھے ذہنی اذیت سے نجات ملی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر آئیں گے اور مجھے پھر اس اذیت سے

دو چار ہوتا پڑے گا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ پھر نہیں آئے۔ البتہ بہت دور سے ان کے ققنوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

مجھے یہاں سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اور نہ یہ معلوم ہو سکا تھا کہ ان غریب قیدیوں پر کیا گزری ہے، جنہیں ان بد معاشوں نے پر غمال بنا رکھا ہے۔ ان قیدیوں میں اس لالچ کے غلے کے لوگ بھی تھے۔ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا تھا اس کی بھی خبر نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں لالچوں کے انجنوں کے چلنے کے شور کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چاروں طرف ایک گہرا سا ناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا تھا ان لوگوں نے بھی کوئی ہل بازی یا شور شراب نہیں کیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو مسلح دیکھ کر اور شاید ان کی دھمکیوں کے خوف سے چپ ہو گئے تھے۔

اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ ان بد معاشوں کے سرغنہ کو میری تلاش ہے اور وہ میرے کارنامے اور فرار سے بہت زیادہ خوف زدہ بھی ہے۔ وہ میری گرفتاری کے لئے ہلچل ہو رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر دت خدا کو پھر سے اغوا کر کے پر غمال بنانا چاہتا تھا کہ تبدیلی انھوں کا آپریشن کر کے تجزیہ کیا جاسکے۔ اس پر تجربے کا بھوت سوار ہو چکا تھا جس کا اتنا آرامان نہیں تھا۔

ہوریوں کے درمیان لیے رہنے سے مجھے زیادہ سرزد محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے سخت خفید آ رہی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی خفید کو بھگا دیا تھا کیا پتا کس وقت جزیرہ آجائے اور میں ان کی قید میں چلا جاؤں۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں ہوریوں کے درمیان سے نکل نہیں سکتا تھا اس لئے کہ عرشے پر پہرہ داروں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہاں اور اس لالچ سے نجات پانے کی کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔

اس طرح چار گھنٹے گزر گئے۔ پھر لالچ کی رفتار دھیمی ہو گئی جیسے ان بد معاشوں کی کوئی منزل آگئی ہو۔ توڑی دیر کے بعد لالچ رک گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس لالچ سے قیدیوں کو اتار دیا گیا۔ قیدی جب اتارنے لگے تو انہوں نے شور شرابا، بھٹ و ٹکر اور دھڑلے سے لڑنا بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ بد معاش انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکیاں دردی تھیں اور ان کی سسکیاں نفضا میں گونج رہی تھیں۔ کوئی چندہ میں منت کے بعد چاروں طرف مراکتا ہوا تھا اور اس لالچ پر کسی کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لالچ شاید اس طرح بیچ تک یہاں کھڑی رہے گی اور اس میں جو سامان لدا ہوا ہے وہ دن میں اتار دیا جائے گا۔ اب مجھے

اس لانچ سے اور اس علاقے سے ہریت پر نکل جانا چاہئے دندنہ یہ بد معاش مجھے بخشیں گے نہیں۔ میں کوئی بوٹ یا کشتی لے کر یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں۔ رات کے تین بج رہے ہیں تمام بد معاش سونے کے لئے جا چکے ہوں گے اور یوں بھی سردی میں خاصی شدت پیدا ہو چکی تھی۔ یہاں تو مجھے سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ یہاں کشتیاں موجود ہوں گی اس لئے کہ یہ گھاٹ تھا میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ بوری بنانے کے لئے بوجھائے تھے کہ میں لانچ کی بیڑھی پر آوازیں سنیں۔ دو تین بد معاش تیزی سے اوپر آ رہے تھے۔ وہ تینوں عرش پر آکر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے چہرے دیکھ نہیں سکتا تھا کمران کے ہاتھ کرنے کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ ہر لفظ واضح تھا۔ ان میں ایک بد معاش جس کی آواز پناہ دار تھی اور فضا میں گونج رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ”غنی! تم انٹیکارو! یہ لانچ اسی وقت دوسرے گھاٹ کی طرف لے جاؤ۔ آٹھ دس آدمیوں کو لے لیا اور تمام بوریوں اور سارا سامان جو یہ وہ صبح سے پہلے لانچ سے اتار لینا۔ سورج نکلنے سے پہلے یہ لانچ کسی گاؤں کے کنارے کھڑی ہوئی ہوگی۔ تم یہ کام پہلے سے کرتے چلے آ رہے ہو۔ چلو بھائی!.....“

”ان قیدیوں کو کہاں بند کیا جائے؟ کیا میں انہیں بھی لانچ میں لے جا کر گودام کے ساتھ والی کوٹھری میں بند کر دوں؟“ یہ دوسری آواز تھی۔

”ان کے بارے میں کل دیکھا جائے گا..... میں نے ان سب کو بیرک میں لے جا کر بند کر دیا ہے اور پھر یہاں سے ان کے بارے میں ہدایات بھی تو حاصل کرنا ہیں۔ پاس شاید انہیں بیرک ہی میں رکھنا پسند کرے۔“

پناہ دار آواز والا بد معاش بیڑھی اتر کے چلا گیا تو غنی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”تم بیڑھی جلدی سے ہٹا لو میں کاک پٹ میں جا رہا ہوں۔“

اب تو کھوار سر ہٹنے لگی تھی۔ یہاں کسی چوہے کی طرح دیکے کہتا فطرے سے خالی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لانچ نے آہستہ آہستہ دیرنگا شروع کیا تو ان بوریوں کے درمیان سے نکلنے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز سے ایک بھری ہوئی بوری ہٹائی اور پھر بوریوں کے درمیان سے نکل کر عرصے پر بیٹھ گیا۔ پھر میں بلنی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا ریٹنگ کے پاس پہنچا۔

ادھر گمراہ اندھیرا تھا اور کسی کے دیکھ لینے کا امکان نہیں تھا۔ میں ریٹنگ میں گئے پانچوں کے درمیان میں سے نکل رہا تھا کہ اس بد معاش نے کاک پٹ میں سے چلا کر پوچھا۔

”کون ہے.....؟ ماجو! یہ کیا تم ہو.....؟ زارو اچھرو آؤ۔“

ایک بد معاش دیکھ چکا تھا میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے بغیر کسی تاخیر کے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ بد معاش پوری قوت سے چیخنے لگا۔ ”پکڑو..... دو ڈو..... ایک آدمی بھاگ رہا ہے..... نذر دل، رسم، قاسم اور ماجو جانے نہ پائے.....“

میں پانی میں چھلانگ لگا کر سطح پر ابھرا اور پھر رہی اندھیرا تھا ہوا تیزی سے مخالف سمت بڑھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد کسی نے ریٹنگ کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر ایک فائر جھونک دیا۔ شاید یہ وہی بد معاش تھا جس نے مجھ دیکھ لیا تھا۔

اس بد معاش کو میں اندھیرے کی وجہ سے نظر نہیں آیا تھا اس نے اندازے سے فائر کر دیا تھا۔ پھر وہ اندھا دھند فائر کرنے لگا۔ میں خوش قسمتی سے اس کے پہلے فائر سے بچ گیا تھا۔ میں خاصی دور نکل چکا تھا۔ اس کے نشانے خطا ہو رہے تھے۔ یہ اندھیرا میرے لئے پناہ ثابت ہو رہا تھا میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اس لئے کہ سرچ لانٹ کی روشنی پڑنے لگی۔ پھر میں نے بہت سارے بد معاشوں کا شور مٹا۔ دو تین مونڑوں کے انجنوں کے اشارات ہونے کی آوازیں سنیں۔ بہت سارے بد معاش میرے تعاقب میں آ رہے تھے۔ شاید ان کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ میں سالار ہوں وہ مجھے ہریت پر پکڑنا چاہتے تھے۔ برے چنے بننے سالار..... میں نے دل میں اپنے آپ سے کہا۔ اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے یہ لوگ تمہارا قیدی بنا کر کھائیں گے۔ یوں بھی ان بد معاشوں کا سرخند آدم خرہ ہے۔

پانی بے حد سرد تھا پھر بھی مرنا کیانہ کرتا۔ میں پانی کے اندر پھنکی کی سی تیزی سے ساتھ تیرتا ہوا چلا رہا تھا۔ میں نے بھی تیر کر لیا تھا کہ یہاں سے نکل جاؤں گا۔ گو یہ ایک طرح سے ناممکن سا لگ رہا تھا پھر بھی میں نے بہت نہیں ہاری تھی اور میرے حوصلے بھی بہت بلند تھے۔ دو تین مونڑوں میں جو میرے تعاقب میں تھیں ان میں سے گولیاں چل رہی تھیں۔ وہ مجھے زندہ بکڑنے کے مؤذ میں معلوم نہیں ہوتے تھے۔ زندہ یا مردہ دونوں صورتوں میں انہیں میری ضرورت تھی۔ اس طرح کوئی نصف گھنڈ گزر گیا۔

آج میری تیراکی کا حاصل امتحان تھا۔ مجھ پر بھی ایسی افتاد آن نہیں پڑی تھی۔ میں نے خطرناک جانوروں سے بڑے بڑے خوفناک جنگلوں میں مقابلہ بھی کیا تھا۔ پہلی مرتبہ

مجھے آزمائش سے گزرنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ بگھل دیش میں پرورش پائی تھی اور عیس پلا رہا تھا میرے گھروالے برصغیر کی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے یہاں آئے تو یہ اس وقت مشرقی پاکستان تھا۔ جہاں میں نے بہت ساری چیزیں سیکھیں تیرہ ماہ تک لیا۔ ندی نالوں اور دریاؤں نے میرے اس شوق کو مزید بھادی۔ میں جب دس برس کا تھا تب سے تیراکی کے بڑے بڑے مقابلوں میں حصہ لینے لگا تھا۔ میں نے تیراکی کے کئی مقابلوں میں اول انعامات بھی لئے تھے۔ میں نے اس شوق کو اس لئے بھی ترک نہیں کیا تھا کہ اس سے مجھے بڑی شہرت ملی تھی اور میں نے بعد میں بھی اسے جاری رکھا تھا بلکہ ایک ماہ تیراکی سے تربیت بھی حاصل کی تھی۔ تیراکی صحت کے لئے بہت اچھی ورزش تھی۔ حکار کے بعد مجھے تیراکی سب سے زیادہ پسند تھی۔ آج تیراکی کا شوق تجربہ اور مہارت میرے کام آئی تھی۔ میں نے ثقافت کی وجہ سے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا۔ اس لئے دشمن میرے تعاقب میں کسی اور سمت نکل گیا تھا۔

میں نے جہاں جہاں اندھیرا دیکھا اور سرچ لائٹ کی روشنی نہیں پڑی تھی وہاں وہاں پانی کی سطح پر ابھر کے دشمن کے آدمیوں کو دیکھ لیتا تھا۔ بہت دور نکل آنے کے بعد جب میں نے انہیں کسی اور سمت جاتے دیکھا تو میں کنارے کی طرف بھاگنے لگا پھر میں ایک کنارے پہنچ گیا۔ یہ دیکھا جس میں 'میں تیرا تھا' گھپ اندھیرے کی وجہ سے میں کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ یہ گاؤں سے یا جزیرہ منارے پر یا کوئی نام روشن بھی نہیں تھا جس سے میں کچھ اندازہ کر سکتا۔ بہت سارے اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا 'میں زمین پر بیٹھ کر سنانے لگا۔ ٹھنڈے پانی میں اور بہت دیر تک تیرے رہنے کی وجہ سے میرے ہاتھ پیر شل سے ہو رہے تھے اور جسم بھی بہت تنگ محسوس کر رہا تھا شاید اس لئے کہ اب پیلے کی طرح میں دیر تک تیر نہیں سکتا تھا اور اب میں زیادہ دیر تک تیرا بھی نہیں تھا۔ سرد ہوا میں چل رہی تھیں اور پانی میں بھی پوری طرح شرابو رہو ہا تھا پھر بھی زمین پر لیٹ گیا۔ لینے سے اور زیادہ سردی محسوس تو ہو رہی تھی مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

پھر میں زیادہ دیر تک لیٹا نہیں رہ سکا اٹھ بیٹھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں لیٹے رہنے سے تو بہتر ہے کہ چلتے رہنا چاہئے۔ اس کنارے پر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ دشمن کے آدمی میری تلاش میں ادھر بھی آسکتے ہیں۔ یہ علاقہ جزیرے کے آس پاس کا تھا یہاں پر چھپے رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

میں نے سردی کی شدت کو کم کرنے کے لئے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر

تک چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں کافی دور تک نکل آیا ہوں۔ مجھے ایک جگہ پہنچ کر رکنا پڑا اس لئے کہ اس جگہ پر جنگل کا ساگنا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں پنسل ٹارچ پڑی ہے۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ وائر پروف تھی اس لئے پانی سے محفوظ رہی تھی۔ گو یہ پنسل ٹارچ تھی مگر اس کی روشنی بہت تھی تھی اور دور تک جاتی تھی میں نے صرف ایک لمبے کے لئے چاروں طرف روشنی ڈالی اس لئے کہ اس روشنی کو دشمن کے دیکھ لینے سے مجھ پر مصیبت نازل ہو سکتی تھی۔

میرا گمان درست نکلا تھا۔ میں ایک گھنے جنگل کے پاس کھڑا تھا۔ ادھر بہت ناک سناٹا اور تاریکی ایسی ہی تھی جیسے جنگلوں میں ہوتی ہے۔ ایسے جنگلوں میں دلدل بھی ہوتی تھی اور ٹالاب بھی 'رات کی وجہ سے میں اپنا سفر جاری رکھ نہیں سکتا تھا اور پھر یہاں کسی درندے کا سامنا بھی ہو سکتا تھا۔ میرے پاس رہو الو تھا وہ اس لئے بیکار تھا کہ اس کی گولیاں پانی میں بھیگنے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہیں رہی تھیں۔ البتہ میرے پاس ایک تیز دھار والا خوفناک چاقو تھا جو اس وقت میرا ساتھی اور مددگار بھی تھا۔ کسی بھی مشکل میں میرا ساتھ دے سکتا تھا۔

میں نے دوسری طرف بڑھ کر اس سمت ٹارچ کی روشنی پھینکی تو وہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے پیچھے ایسے لگا جیسے کوئی جھوٹا جزیرہ بنی ہوئی ہو۔ جنگل میں درختوں کے بیچ کسی کنیا کا بنا ہوا ہو یا تجارت گنیز اور ناقابل یقین تھا۔ میں اپنا ٹھکانہ دور کرنے کے لئے اس طرف بڑھا تو میرے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی دائیں ہاتھ میں چاقو تھا یہاں کنیا تھی تو آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ آدمی ہو سکتا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں قریب میں نہ سہی کسی قدر دور کوئی آبادی بھی ہو سکتی تھی۔ انسان کہاں کہاں اپنا سر چھپاتا پھرتا ہے اور خدا اسے وہاں بھی رزق پہنچاتا ہے۔

میں دبے پاؤں اور بڑے محتاط انداز سے اس کنیا کی طرف بڑھا۔ اس قدر احتیاط کے باوجود بچے میرے کے پیروں تلے آکر چھرائے۔ پھر میں رک رک کر بڑھا اور دروازے پہنچ گیا اس کا دروازہ مضبوط چٹائی کا تھا اور بند تھا۔ باہر اس کی کنڈی میں ایک چھوٹا سا کالا لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس میں کوئی رہتا ہے اور وہ اس وقت یہاں نہیں ہے کہیں گیا ہوا ہے۔ اس وقت کیا معنی تک اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

میں نے پہلے ٹوٹا لے کر کچرے کے زور سے بلایا وہ نہیں کھلا تو اسے بڑے زور سے ایک جھٹک دیا۔ پھر وہ کھل گیا۔ میں نے ٹال نکال کر زمین بے پروائی سے پھینک دیا اور کنیا کے

اس کنیلا کے ایک کونے میں مٹی کے جل کا چو لہا اور ایک کنستہ بھی رکھا تھا۔ چائے بنانے کی ایک کیتلی بھی تھی۔ ایک چھوٹے سے کارن میں چائے کی پتی 'ایک کپ' شکر اور خشک دودھ کا ایک ڈبہ بھی تھا ایک خمروس بھی تھا جس میں پانی تھا گویا یہاں کوئی رہتا بھی تھا۔ میں نے بغیر کسی تکلف کے چائے پانی۔ چائے سارے پانی کی بنائی تھی۔ میں نے دو کپ چائے پی تو بدن میں حرارت 'تازگی' اور توانائی لوٹ آئی تھی۔

چائے پینے کے بعد میں چو کی پریٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کنیلا کہاں کس لئے بنائی گئی ہوگی اور یہاں کون رہتا ہو گا۔ جو رہتا ہو گا وہ کس مقصد کے لئے رہتا ہو گا۔ کیا معلوم یہاں کسی بد معاش نے اپنی رہائش بنائی ہو۔ یہ بد معاش کوئی بھی مفروضہ ہو سکتا ہے جو پولیس کو مطلوب ہو۔ وہ شکاریوں کو شکار کرتا ہو۔ اس نے کسی شکاری کو یہاں لاکر قتل کیا ہو گا اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے لے گیا ہو گا رات زیادہ ہونے کی وجہ سے نہیں آیا ہے۔

سوچتے سوچتے میں گہری نیند سو گئی۔ نیند کے غلبے اور تھکن نے مجھے جاگنے نہیں دیا۔ میں شاید ہی ایسی گہری نیند کبھی سویا تھا۔ جب میں بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ نیند کی وجہ سے میں اپنے سارے بدن میں ایک تروتازگی سی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے بھوک لگنے لگی تو میں نے چائے بنا کر پی۔ پھر کنیلا سے باہر آیا۔ میں کنیلا سے باہر آیا تو سردی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ میں درختوں کے جھنڈے سے باہر نکلا تو مشرقی افق پر سورج چمک رہا تھا۔ آس پاس جو اونچے اونچے درخت تھے ان کی شاخیں سرد ہوا کے جھوکوں سے جھوم رہی سی تھیں۔ ہمیں طرف اونچی نیچی پھاڑیوں کا سلسلہ تھا جو درخت چلا گیا تھا۔ اس جگہ پر رنگائی کے جنگل کا دھوکا ہو رہا تھا۔ ان پھاڑیوں پر سبزہ اگا ہوا تھا جو دوسے دھڑلے نظر آ رہا تھا۔ میں نے کنارے پر دو موٹر بوٹس کڑی دیکھیں تو میں گھبرا کے اٹنے قدم درختوں کے جھنڈ میں چلا آیا۔ کوئی بد معاش وہاں نظر تو نہیں آیا لیکن میں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ بد معاش! اھر میری تلاش میں آگئے تھے اور شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اب تو اس کنیلا میں روپوش ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ جنگل تھا جو اس قدر خوفناک گھنا اور تاریک دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے اندر رات بنانا مجھے آسان نہیں لگ رہا تھا مگر مجبور ہی تھی کہ مجھے اس کے اندر ہی سے گزرنا تھا۔ اگر مجھے کنارے پر بوٹس نظر نہ آتیں تو میں ساحل کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا۔ صبح کے وقت دیا بھی پڑ سکون ہو تا اور اس کے پانی کے بہاؤ میں سبک خروا ہی ہوتی ہے جو سورج کے نمازت میں آنے کے بعد دم توڑ دیتی ہے۔ میں دبا میں تیرتا ہوا کسی بھی قریبی گاؤں

اندر داخل ہو کر تاراج کی روشنی میں اسے دیکھا۔ یہ درمیانہ سائز کے ایک کمرے جتنی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں معامیری نظریوں کی پڑی جو دیوار سے لگی تھی۔ اس پر کپڑے اور کچھ چیزیں بکری تھیں اور اس کے سین اوپر ایک طاق تھا اس میں ایک بڑی سی لائین اور ماچس رکھی تھیں۔ میں نے چو کی پرچہ کر ماچس اٹھائی اور لائین نیچے انارکروچی پر رکھ دی۔ ماچس میں دیسلایاں تھیں۔ میں نے لائین جلائی اور اس کی جتنی کی بو بڑھائی تو کمرہ روشنی میں نہ گیا۔

مجھے شدید سردی لگی رہی تھی اس لئے جتنی کے اوپر ہاتھ رکھ کر اس کی سوسے ہاتھ تاپنے لگا۔ ہاتھ تاپتے تاپتے میں نے کپڑوں کی طرف دیکھا تو ایک دم اچھل پڑا۔ ایک سرد لبر میری بڑھ کر ہڈی میں جمید کرتی ہوئی اتر گئی۔ کپڑے خون آلود پڑے تھے اور ان میں جو خون لگا ہوا تھا وہ تازہ لگ رہا تھا یہ کپڑے کسی شکاری کے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کپڑے اٹھا کر دیکھے تو اس کے نیچے ایک پتول تھا۔ اس پتول کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں چار گولیاں تھیں میں نے فرش پر دیکھا تو اس پر جا بجا پونچ پڑا تھا اور دروازے تک چلا گیا تھا اب لگ رہا تھا جیسے یہ قتل کی واردات ہے۔ کسی بد معاش نے ایک شکاری کو قتل کرنے کے بعد اس کے خون آلود کپڑے اتر دینے اور اسے جیسے چادر میں لپیٹ کر لے گیا ہو۔

میں نے کپڑوں کی تلاشی کی تو اس میں ایک شکاری چاقو ایک پرس اور درمال برآمد ہوا۔ پرس میں دو ہزار ٹاکا چھوٹے اور بڑے نوٹوں کی شکل میں تھے۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس مقتول شکاری کی شناخت ہو سکتی۔ کمرے میں ایک طرف شکاری کے جوتے اور موزے بھی پڑے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا معرہ ہے۔

میں نے جو تے دیکھے تو اتفاق سے وہ میرے ناپ کے تھے میں نے اپنے جوتے اور موزے نکال کر وہ جوتے اور موزے چڑھائے اس لئے کہ جوتے پانی میں بار بار جھینکتے اور بڑی دیر تک جھینکے رہنے سے نرم ہو رہے تھے پھر میں نے اس کا پرس اور پتول بھی جیب میں رکھ لیا۔ خون آلود کپڑے نکال کر ایک طرف ڈال رہا تھا تو میری نظریں چو کی کے سر پائے پر پڑی۔ ایک میلی سی چادر کے نیچے سے ایک دہنی بیگ جھانک رہا تھا۔ میں نے اس بیگ کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک صاف ستھرا جوڑا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب سا اتفاق تھا کہ یہ لباس بھی میرے سائز کا تھا جیسے اس میں میرے لئے رکھا گیا ہو۔ میں نے اپنا گیلہ لباس نکال کر اسے پہننے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کی۔ کپڑے بدلنے سے میری سردی کم ہو گئی تھی۔

میں پہنچ جاتا اور اس طرح مجھے دشمن کی دسترس سے نکل جانے میں آسانی ہو جاتی اور دشمن کو ناکامی کا سہہ دیکھنا پڑتا۔

پنسل مارچ کی روشنی کی مدد سے میں تیزی کے ساتھ درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ایک سمت چل پڑا۔ ایسے تاریک اور گھٹے جنگل سے گزرنے کا یہ پہلا اتفاق نہیں تھا۔ ملایا کے جنگل اس سے کہیں گھٹے اور تاریک تھے۔ وہ اس لئے بہت زیادہ خطر ہوتے تھے کہ دلدلی بھی ہوتے تھے۔ مجھے ملایا کے جنگل یاد آئے تھے۔ اس جنگل میں بھی دلدل کا گمان ہو رہا تھا۔ جنگل میں دلدل ضرور ہوتی ہے اس لئے میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے ایک سمت درختوں کی اوٹ میں سے سورج کی روشنی نظر آئی۔ یہ ایک تیز اور روشن لکیر تھی۔ میں نے اپنا رخ اس طرف کر لیا جب میں نے خاصا فاصلہ طے کر لیا تب مجھے ایک جگہ رکنا پڑا۔ وہاں بڑے زمین جو تھے وہ دلدلی تھی۔ میں محسوس کر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بہت دور سے ایک تیز اور سنسناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میرے کان دھوا کانسیں کھا سکتے تھے۔ یہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک جانور کی آواز بھی سنائی دی جو معلوم نہیں کس جانور کی تھی۔ پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولی چلنے اور جانور کے غرغرائے کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ آدمی اور جانور کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔

چند لمحوں کے بعد پھر شائسا جھانپا گیا۔ میں دلدلی جگہ کے کنارے سے ہوتا ہوا پھر چل پڑا۔ میں نے اپنی جیب سے پتول نکال لیا اس لئے کہ کسی بھی خطرناک جانور سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ ابھی جو گولی چلی اور جانور کی آواز سنائی اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں خطرناک جانور موجود ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک کٹے میدان میں پایا۔ آس پاس جھاڑیوں کا بھی سلسلہ تھا۔ بائیں طرف پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ دریا کی لہریں ان سے ٹکرا رہی تھیں فضا میں ان کا شور مچ رہا تھا۔ اس جنگل کا ایک سرا ان پہاڑیوں کے پاس جا کر ختم ہوا تھا۔

میں جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ چند قدم چلا تھا کہ مجھے ٹھٹک کے رکنا پڑا۔ زمین پر خون کے دھبے تھے۔ یہ دھبے جا بجا نظر آرہے تھے۔ اس جگہ کسی لڑائی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کسی بڑے جانور نے جو شدید زخمی حالت میں تھا جھاڑیوں کو بری طرح روندنے کی کوشش کی ہے کیونکہ زمین پر اس کے ہونے چھوٹے چھوٹے جنگلی پودے اور گھاس روندی ہوئی سی تھی اور جگہ جگہ خون ہی خون بکھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں خون

کے دھبے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ معامری نظر ایک پھوٹی سی پچیلی چیز پر پڑی۔ میں نے بنگ کر اسے اٹھایا وہ ایک خالی کارٹوس تھا۔

اب میرے لئے یہ بات صاف اور واضح ہو گئی تھی کہ یہاں کسی آدمی اور خوفناک جانور کے درمیان مقابلہ ہوا ہے۔ یہ آدمی شکاری نہیں تھا۔ شکاری ہوتا تو وہ ہندوق سے فائر کرتا۔ بہت کم شکاری ریوالتا پتول استعمال کرتے تھے۔ میں نے پتول چلنے کی آواز سنی تھی یہ کارٹوس بھی پتول کی گولی کا تھا۔ یہ آدمی اگر شکاری نہیں تھا تو اس کی ذہانت کی داد دینا پڑتی تھی کہ اس نے ایک پتول سے ایک بڑے جانور پر قابو پایا۔ ان دونوں کے درمیان مقابلے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آثار سے ایسا لگ رہا تھا کہ جانور زخمی ہو کر بھاگ گیا ہے۔

مجھے دوسری طرف شکاری پونوں کے نشان نظر آئے۔ گویا یہ شخص شکاری ہی تھا۔ میں ان نشانات کو دیکھتا ہوا زمین کا معائنہ کر رہا تھا کہ چانک کر اپنے کی آواز سنائی دی۔ یہ جانور کی نہیں کسی انسان کے کرانے کی آواز تھی۔ سامنے والی جھاڑیوں میں سے سنائی دے رہی تھی۔ میں اس طرف تیزی سے بڑھا۔ جھاڑیوں کے پار ایک مکلی جگہ تھی جو جھاڑیوں سے گھری تھی۔ ان جھاڑیوں کے قریب ایک شخص زمین پر پڑا اور رواڑیت سے تڑپا ہوا کرہا رہا تھا میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

اس آدمی کو دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ سمجاش نہ تھا۔ ایک مشور اور تجربہ کار شکاری۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور اس حالت میں دیکھ کر کہہ بھی وہ شدید زخمی حالت میں تھا۔ اس کے ہاتھ کی آستین لپٹی ہوئی تھی اور بازو میں زخم اور خراشیں تھیں۔ ان میں سے خون بہہ کر اس کی آستین کو گیلیا چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت زخم تھے۔

اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ آخری سانس لے رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اسے بڑی آہستگی سے پکارا۔

”سمجاش دے!“ اس نے میرے آواز دینے سے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی آنکھیں نہیں کھولیں تو میں نے اس کا شانہ بہت آہستگی سے ہلایا۔ ”سمجاش دے!“ آنکھیں کھولیں۔ ادھر دیکھو۔“

سمجاش دے نہ آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی دیران اور پتھرائی آنکھوں میں سے وہشت جھانک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی

دھلک گئی۔ وہ اس دنیا سے چل دیا۔

اس کی موت بھی مشتاق چوہدری کی طرح افسوسناک حالت میں ہوئی تھی۔ مشتاق چوہدری شدید زخمی حالت میں کسی نہ کسی طرح اپنے گھر پہنچ گئے تھے وہ بڑے سخت جان تھے جو اس زخمی حالت میں دوایک دن زندہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں دم توڑا تھا۔ سہاش دہ کی موت ایسی جگہ پر واقع ہوئی جہاں سے اسے آخری منزل پر پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بند کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سہاش کی الم ناک موت جس حالت میں جس طرح سے ہوئی تھی اس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ میری آنکھیں آپ ہی آپ پر نم ہو گئیں۔ میری جگہ کوئی اور بھی فحش ہوتا اس آدمی کو دردناک انداز میں مرتے دیکھنا تو اس کے دل میں بھی دکھ ہوتا۔ سہاش دہ میرے شکاری دوستوں میں سے تھا اس کی موت سے میرے دل کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ فطری امر تھا۔

سہاش دہ کی اس دردناک موت میں اس درندہ مفت فحش کا ہاتھ تھا جو انسانوں کا شکاری تھا۔ سہاش دہ کو موت نے تھوڑی سی مسلت اور دی ہوئی تو میں اس سے اس درندہ مفت فحش کے بارے میں معلوم کر لیتا۔ مجھے صرف اس کا نام معلوم ہو سکا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ کیا ایک ڈاکٹر ایسا شقی القلب بھی ہو سکتا ہے؟

سہاش دہ کی دردناک موت جن حالات میں واقع ہوئی تھی اس نے مجھے ایک خطرے سے آگاہ کیا کہ میں بھی اس درندہ مفت فحش کے حصار میں ہوں اور وہ میرا بھی شکار کر سکتا ہے۔ اور میں اس کے زیرے میں پھنسا پھر رہا ہوں۔

میں سہاش کی موت کی آخری رسومات ادا کرنا چاہتا تھا جو اب میرے لئے ناممکن تھا اس لئے کہ وہ درندہ مفت انسان کسی بھی لمحے اپنے شکاری تلاش میں آسکتا ہے اور اسے یہاں سے اٹھا کر لے جاسکتا ہے۔ وہ اپنے کئے کو زخمی حالت میں باکر ضرور آئے گا۔ اب مجھے اپنا چاہو کرنا چاہئے۔ میں تیزی سے سوچنے لگا۔ ورنہ میں اس کے چنگل سے بچ نہ سکوں گا۔ یوں بھی اسے میری تلاش ہے۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے کچھ آدازیں سنیں جو تین چار آدمیوں کی تھیں۔ وہ اس طرف بڑی تیزی سے آرہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سہاش دہ کا پتھول اس کے پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا پھر میں دوسری طرف بھاڑیوں میں پک گیا۔ میں ان بھاڑیوں کے پاس پہنچا تھا کہ میری پشت پر ایک تیز دند آواز گونجی۔ ”رگ جاؤ“

چمک اور حیرت سی چھا گئی۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ”مسٹر سالار! آپ اور یہاں.....؟“

”ہاں میں.....“ میں اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ ”آپ یہاں کیسے.....؟ کیا آپ یہاں شکار کے لئے آئے تھے؟“

”نہیں.....“ اس نے اپنے سر کو جھنجھڑا دیا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ ”مجھے یہاں..... ڈاکٹر ادیس نے انوا کر لیا ہے۔ اس نے مجھے یہ غلام بنا کر رکھا تھا۔“

”ڈاکٹر ادیس.....؟ یہ کون ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام سنا تھا۔

”ڈاکٹر پوکیش..... درندہ مفت آدمی ہے بلکہ اسے آدم خور کہنا چاہئے۔“ سہاش دہ کو باتیں کرتے ہوئے بڑی اذیت و تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کی سانسیں بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”وہ انسانوں کا گوشت کھاتا ہے۔“

”کیا آپ یہاں سے فرار ہو رہے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”آپ کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ کیا کسی درندہ نے حملہ کیا تھا آپ پر؟“

”نہیں.....“ اس نے مجھے اپنی پچھلی پچھلی دہشت سے بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ”وہ غیث اس جنگل میں میرا شکار کھیل رہا ہے اس کے ساتھ کتے بھی ہیں۔ اس کے ایک کتے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ وہ میرے پتھول سے زخمی ہو کر بھاگ گیا۔“

میں نے چو کیا ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے سارا دے کر کھانے کے لئے بھگا۔ ”ذرا ہٹ کر کے اٹھ بیٹھو سہاش دہ میں آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”سالار!.....“ وہ تھابت سے بولا۔ ”میں مر رہا ہوں۔ بس چند لمحوں کا مسمان ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں اور آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ آپ کی جان بھی خطرے میں.....“

اس کی سانسیں اکڑنے لگیں میں نے اس کی نبض دیکھی وہ ڈوب رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بدترارہے تھے میں اپنا کان اس کے منہ کے پاس لے گیا وہ کہہ رہا تھا۔ ”سالار!..... سالار..... آپ..... بھاگ جائیں۔ وہ شیطان آنے والا.....“ اس کے ہونٹوں نے بدترابند کر دیا۔ دوسرے لمحے اس کی گردن ایک طرف

میں تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔"

میں ایک دم سے ٹھک کے رک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مجھ سے کوئی بیس بائیس فٹ کے فاصلے پر تین بد معاش کھڑے تھے۔ ان کے چروں سے خباثت نکل رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں دردندگی تھی۔ چروں پر سفاکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک چمرا، تیسرا ہنرے ہوئے تھا۔ جبکہ تیسرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ ان میں ہاتھ میں وہ پستول جو لکڑیاں ملا تھا۔ دوسرا پستول بھسا دیا تھا۔

"پستول پھینک دو....." پستول والے نے تمھارے لیے میں کہا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے....." میں نے سخت لہجے میں اسے جواب دیا۔

"میں کون ہوں تمہیں جلدی پتا چل جائے گا۔" وہ کہنے کی طرح غرایا۔

"تمہارے چہرے ہی سے پتا چل رہا ہے کہ تم کون ہو۔ تم ایک نمبر کے بد معاش لگ رہے ہو۔"

میرے اس جملے پر وہ مشتعل ہو گیا۔ میں ہاتھ پائی بھی نہیں تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو جائے۔ اس نے پستول سے میرا نشانہ لینے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے پستول نہیں پھینکا تو ہم تمہاری ٹکا بوٹی کر دیں گے۔ میں کہتا ہوں پھینک دو پستول....." وہ بری طرح دھماکا تو اس کا ہم کاٹنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ والا پستول اس کی طرف پھینکا۔ وہ پستول ٹھیک اس کے منہ پر گیا تو اس نے پستول پکڑنے کی کوشش کی۔ میرے لئے یہ سنہرا موقع تھا اور میری چال کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ میرے پستول کی گولی اس کے دائیں بازو میں پوسٹ ہو گئی اور اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ایک فلک بازی لکھا گیا۔ میں نے اسے سنبھلے نہیں دیا و دوسرا فائر بھی جھونک دیا۔ گولی اس کے بائیں کندھے میں اتر گئی اور وہ الٹ کر زمین پر گر پڑا اور درد و آفت سے لوٹنے لگا۔ اب وہ پستول چلانے یا اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے اس کا یہ مشر جو دیکھا تو وہ بدحواس سے ہو گئے۔ جس کے ہاتھ میں ہنر تھا وہ چہرے والے بد معاش سے ٹکرا کے زمین پر گر پڑا۔ میں نے ان

دونوں پر پے در پے دو فائر کر دیئے۔ دونوں گولیاں چہرے والے بد معاش کے گلےں۔ ایک گولی تو اس کی دائیں ٹانگ پر دوسری اس کے کولے پر لگی..... وہ چیخ مار کر زمین پر لوٹنے لگا اور گالیاں بکنے لگا۔ میں نے ہنر والے پر فائر کیا جو سرعت سے کھڑا ہو گیا تھا۔ فضا میں ٹھک کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اس وقت میں بے ہوش تھا کہ پستول میں صرف چار گولیاں ہیں۔ بھر میں نے خانہ پستول ہنر والے بد معاش پر پہنچ مارا۔ وہ ایک طرف ہو گیا تو پستول اس کے پاس سے گزرتا ہوا اچھاڑیوں میں جا گیا۔

میں زخمی بد معاش کی طرف بھکی کی سی تیزی سے لپکا کہ اس کا پستول اٹھاؤں۔ ہنر والے بد معاش نے مجھے ہنسا پیا تو وہ شیر ہو گیا اور تیزی سے میرے راستے میں جا کر ہو گیا۔ میں ایک دم سے رک گیا۔ وہ اپنا ہنر کھول کر فضا میں لہرا ڈاڑ زمین پر مارتا ہوا میری طرف بڑھا تو اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے مشر نے اس کے دماغ کو کھولا دیا تھا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری چھڑی ادا میرے رکھ دے گا اور خون پانی جائے گا۔ میرے پاس اتنی مصلحت نہیں رہی تھی کہ اپنی جیب سے چاقو نکال سکوں۔ جیب کاٹھن کھولنے میں دیر ہو گئی تھی، وہ میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ پستول والا بد معاش جو درد سے تڑپ رہا تھا وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "اس سڑ کو چھوڑنا نہیں....."

"تم نے بت بڑا کیا میرے دونوں ساتھیوں کو زخمی کر کے....." وہ غصے اور حقارت سے بولا۔ "میں تمہارا بھی دی مشر کروں گا جو اس کا ہوا ہے۔" اس نے بے معاشی دت کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "تم مجھے نہیں جانتے ہو میں کون ہوں۔"

میں نے اسے باتوں میں لگا کر جب سے چاقو نکالنے کی مصلحت کے لئے اس سے کہا۔ "واقعی میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟ دیئے تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تم فرید پور کے قصائی ہو کیوں؟ قصائی ہونا.....؟"

"میں قصائی نہیں موت ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "مجھ سے فرید پور کے تمام بد معاش کا پتہ ہیں۔ میرے نام سے پولیس بھی پھرتی ہے۔ جو میرے مقابلہ پر آیا وہ میرے ہاتھ سے زندہ نہیں بچا..... ابھی تمہیں پتا چل جائے گا میں کیا چیز ہوں....."

دورا تم تباہ تو تم کیا چیز ہو۔"

"میرا نام سالار ہے۔"

"تم سالار ہو.....؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر اس کی

آنکھوں میں جذب ہونے لگا۔ میں نے اس کی طرف جوابی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا میں اپنی میران کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”میں آپ کی میران نہیں بلکہ خدمت گار ہوں۔“ اس نے گفتگو لمبے میں جواب دیا۔ ”آپ کے میران کا نام ڈاکٹر اوئیس ہے۔“

”ڈاکٹر اوئیس.....؟“ میری نظروں کے سامنے ایک کوندانایا کی میری نظروں میں سہماش دے دی بے گور وخن لاش گھونے لگی۔ سہماش دے سے مرنے سے قبل ڈاکٹر اوئیس کا نام بتایا تھا۔ ڈاکٹر اوئیس جو قاتل تھا درندہ صفت تھا۔ آدم خود تھا۔ انسانوں کا شکاری تھا انسانیت کی پیشانی پر ایک بدمراد آغ تھا۔ وہ بھیڑیا تھا۔

”میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا نام.....؟“ وہ جو کچھ کی پھر سنبھل کر بولی۔ ”میرا نام بالی ہے مجھے گھر میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔“ اس کی حسین آنکھوں میں اداسی تیر گئی۔

”نام بھی آپ کی طرح سندر ہے۔“ میں مسکرایا۔ ”کیا میں آپ کے پاس اور اپنے میران ڈاکٹر اوئیس سے مل سکتا ہوں۔“

”اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں۔“ اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”آپ چائے پی کر تیار ہو جائیں میں ٹھیک آٹھ بجے آپ کو لینے آؤں گی۔ ڈاکٹر اوئیس کھانے کی میز پر آپ کے منتظر ہوں گے۔“

پھر وہ اجازت لے کر شائستہ انداز سے معذرت کر کے کمرے سے نکل گئی۔ ٹھیک آٹھ بجے میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہالی مسکنی اور مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی ’وہ مجھے کھانے کی میز پر لے جانے آئی تھی۔ میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آیا تو وہ پورے وقت خوفناک کنارے کی طرف کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خراٹے لگاتے بالی نے اسے ڈانٹ کر چپ کرایا۔ میں سسٹان راہداری سے ہوتا ہوا اس کے ساتھ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ راہداری میں دس بارہ داییں بائیں کمرے تھے جیسے وہ طوں میں ہوتے ہیں۔

بالی نے دروازے پر مخصوص انداز سے دستک دی۔ پھر اس نے ہینڈل لاک پکڑ کے مھمایا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ اتنا کھلا کہ ایک آدمی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو یہ ایک بہت شائبدار آراستہ وپیراستہ عظیم الشان ڈرائنگ اور ڈائننگ ہال تھا۔ ایک صوفے کے پاس

ڈاکٹر اوئیس میرے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔

میری نظروں کے سامنے ایک ایسا درندہ صفت شخص کھڑا میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جس نے اپنی درندگی اور بربریت سے پورے ہنگامہ میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا اور اس کی دلوں پر ایسی دہشت چھائی ہوئی تھی کہ لوگوں نے لائچوں اور چھوٹے سینٹروں میں رات کو سفر کرنا بند کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں اس شخصیت کا جو خاکہ تھا وہ کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ دیکھنے میں کسی بلا دیو پشہ و قاتل کی طرح دکھائی دیتا ہو گیا پھر کسی درندہ سے ملتا جلتا ہو گا۔ اس کی آنکھوں میں درندگی اور چرے پر سفاکی ہوگی وہ کسی صورت سے انسان لگتا ہی نہیں ہو گا۔

گھبرے ڈاکٹر اوئیس تو اس کے برعکس تھا وہ سفید براق قبض کالی ٹائی اور کالے رنگ کے عمدہ اور نفیس سوٹ میں ایک مہذب ترین آدمی لگ رہا تھا۔ یہ تضاد میرے لئے حیرت انگیز، تعجب خیز اور ناقابل یقین تھا۔ کوئی شخص اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے اندر ایک درندہ صفت آدمی چھپا ہوا ہے۔ اس کے ہونٹوں اور چرے پر جو مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی وہ بڑی درستانہ تھی۔

وہ میری طرف والمانہ انداز سے بوجھ اس طرح جیسے میں اس کا برسوں سے بچھڑا ہوا کوئی دوست ہوں۔ اس نے میرے پاس پہنچ کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بڑے شائستہ انداز سے کہا۔ ”ہیلو مسٹر سالار! میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”حیرت ہے۔“ میں نے بھی بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”کی جتنی ہوئی آنکھوں میں ہنسنا۔“ ”آپ اپنے دشمن کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں؟“

”میں اپنے دشمن کو نہیں بلکہ دنیا کے ایک بڑے اور عالمی شہرت یافتہ شکاری کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں جس سے آج مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ گو میں جانوروں کے شکار کا زبردست مخالف ہوں لیکن دوسری طرف چونکہ میں خود بھی ایک شکاری ہوں اس لئے آپ کی آمد کو میں اپنے لئے ایک اعزاز سمجھ رہا ہوں۔ ایک شکاری کی قدر ایک شکاری ہی کر سکتا ہے۔“ وہ سنی خیر انداز سے مسکرایا۔

”کچھ مجھ میں اور آپ میں ایک فرق ہے۔“ میں بھی جواب مسکرایا۔ ”میں جانوروں کا شکاری ہوں اور آپ انسانوں کے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم دونوں ہی جانوروں کے دشمن ہیں اور جانوروں سے کھیتے ہیں۔“

”فرق کیوں نہیں پڑا؟“ ڈاکٹر اویس!.....“

میں اپنی بات پوری نہیں کر سکا اس لئے کہ سامنے والے کمرے کی دہلیز پر لہرا ہوا پردہ ہٹا اور میں نے ایک حسین اور طرح دار عورت کا چہرہ اور سراپا دیکھا جس نے اس عورت کو پہچان لیا یوں مجی بردہ حسین چہرہ کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد عرصے تک نہیں بھولتے ہیں۔ جبکہ اس عورت کے ساتھ میری بہت ساری گھڑیاں گزری تھیں۔ اسی عورت کی وجہ سے تو میں یہاں تک پہنچا تھا۔

یہ بتیم جمال تھی، وہ مسکرتی ہوئی ہماری طرف آئی تو ڈاکٹر اویس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے انہیں پہچان لیا ہو گا؟ یہ میری دوست ہیں۔“

”بہت اچھی طرح.....“ میں نے بتیم جمال کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ ”یہ بھی ایک حسین شکاری ہیں انہیں بھی شکار کرنا خوب آتا ہے۔“

”کھانے کی میز پر چلے رو نہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ بتیم جمال نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

لبی چوڑی میز پر پر تکلف چائینز کھانا چٹا ہوا تھا۔ بتیم جمال نے درمیانی جگہ منہمالی، میں اور ڈاکٹر اویس ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ بتیم جمال نے میری طرف جھکن کارن سوپ کا پیالہ بولا۔ ”میرے خیال میں آپ کو چائیز ڈشیں پسند ہوں گی؟“

”جی ہاں.....“ مجھے ان کی ڈشیں بہت مرغوب ہیں۔“

”میں نے آپ کی تازہ ترین کتاب کا ٹکڑا ایڈیشن کل رات ہی پڑھا ہے۔ آپ بہت خوب لکھتے ہیں اور شکار بھی خوب کرتے ہیں۔ آپ کی تمام کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔“

میں آپ کی کتابوں کا بہت مداح ہوں۔“

”شکریہ.....“ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔ ”مداح بھی ہیں اور دشمن بھی.....“

”جی ہاں.....“ اس نے سوپ میں چمچ ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگا۔

”آپ کے آدمیوں نے میری جان لینے میں کئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور آپ جو تجربہ مجھ پر کرنے والے تھے کیا وہ انسانیت سوز نہیں تھا؟“

”میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی تھی کہ آپ کو اس قدر خوفزدہ کیا جائے کہ آپ ڈھاکا کے شہر چھوڑ جائیں اور میرے خلاف آپ کو منصوبہ بنا کر آجے تھے اس پر عمل نہ

کر سکیں اس لئے آپ کو پتہ پر آپ کا تھانہ حملہ کیا گیا۔“

”تو کیا آپ کو میری ذات سے یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ میں آپ کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جاؤں گا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ پہلے شخص ہیں جس نے میری تنظیم کو زبردست نقصان پہنچایا۔“

”اس کا اندازہ آپ کو میرے بارے میں کیوں کر اور کیسے ہوا جبکہ میری آپ سے کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی؟“ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”آپ کی کتابیں پڑھ کر۔“ وہ کہنے لگا۔ ”آپ جو اتنے بڑے شکاری ہیں جتنے وہ شخص تجربے کی بنا پر نہیں بلکہ ذہانت کی وجہ سے جتنے ہیں۔ آپ نے اپنی ذہانت کی وجہ سے بڑے بڑے خطرناک جانوروں کو زیر کیا ہے۔ آپ کی کون سی کتاب ایسی ہے جسے پڑھ کر میں عیش و عشرت نہ کر سکا ہوں۔“

”میری آپ سے جو چھ سات گھنٹے ہو ملاقات رہی ہے اس سے میں بھی آپ کی ذہانت سے بڑی خائف ہو جی تھی اور مجھے اپنا منصوبہ نفل ہو تا دکھائی دیا تھا اگر میرا منصوبہ کامیاب نہ ہو تا تو پھر آپ یہاں نہ ہوتے اور پھر میری شامت آجاتی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم باتوں کی وجہ سے کھانے پینے سے انصاف نہیں کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر اویس بولا۔ ”باتیں کھانے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔“

ڈاکٹر اویس نے غلط نہیں کہا تھا پھر میں تو اس خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے، کھانا بہت عمدہ اور مزیدار تھا۔ میں نے کھانے کے دوران ڈاکٹر اویس کی غیر محسوس انداز سے ناقدانہ جائزہ لیا۔ گو وہ اوسط عمر کا آدمی تھا مگر وہ ان کی طرح صحت مند اور توانا تھا

اس کی کپڑی کے بالوں میں سے سفیدی کی چھابک رہی تھی وہ کسی آمر کی طرح دکھائی دے رہا تھا جو انکسارت جاری کرنے کا عادی ہو تا ہے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد ہم تینوں اٹھے اور صوفوں پر جا بیٹھے تو کمرے کے اندر ایک شخص داخل ہوا جو دیو قامت تھا میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی اتنے بلند قد کا آدمی دیکھا ہو

اس کا جسم بھی فولادی طرح مضبوط تھا۔ قبض کی آستین میں اس کے بازوؤں کی پھلیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آدمی نہیں دیو ہے، وہ میرے برتن کیسے لگا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا بڑا وفادار غلام ہے۔“ ڈاکٹر اویس مجھے بتانے لگا۔ ”یہ میرے پاس پانچ

برس سے ہے اس کی وجہ سے کتنی مرتبہ میری جان بچ چکی ہے، مجھے اس پر جتنا بھروسہ ہے
اتنا کسی اور پر نہیں۔“

اس وقت بالی ایک ٹرے میں کافی لئے ہوئے آئی اور ہم سب کو کافی دے کر چلی گئی تو
میں نے اس سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر اویس..... آپ کون سے ڈاکٹر ہیں؟.....“
آپ نے پلایچ ڈی کیا ہے یا.....“

”میں سرجن ڈاکٹر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں برس تک دنیا کے مختلف
ہسپتالوں میں ملازمت کی ہے، ایک ہزار سے زائد بڑی کے آپریشن کر چکا ہوں، پھر میں
اس پیشے سے انکار کر دیا، اس لئے کہ میرا وطن اور سرزمین ہے۔“

”حیرت ہے، آپ ایک سرجن ہیں اور مقدس پیشے کے برخلاف انسانوں کا شکار
کرتے ہیں اور ان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔“

”کیا آج کل کے ڈاکٹر انسانوں کا شکار نہیں کرتے اور ان کی جانوں سے نہیں
کھیلتے؟“ وہ مضبوط سہمے میں بولا۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر انسانیت کی ہٹا کے لئے
کوشاں ہیں۔ وہ انسانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔“

”آپ کو سی دنیا میں رہتے ہیں مسز اسرار!“ ڈاکٹر نے ایک قہقہہ لگایا اور کافی کا
ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”آپ ذرا سرکاری ہسپتالوں اور پرائیویٹ کلینک
میں جا کر دیکھیں، آج کل کے ڈاکٹر ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں، کتنے لوگ مر رہے
ہیں، کتنوں کو تجربات کی ہیمنٹ چڑھاتے ہیں، کتنے مریضوں کی روزانہ کھال ادھیرتے ہیں،
گاڑیاں خریدتے ہیں، غیر ممالک کی سیروسااحت کو جاتے ہیں، کونھیاں اور بچکے بناتے
ہیں۔ میں انسانوں کی جانوں سے کھیلتا ہوں تو کیا بڑا کرتا ہوں۔“

”آپ نے بھی شیر کا شکار کھیلا ہے؟“ میں نے اپنی کافی ختم کر کے تپائی پر گم رکھتے
ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں.....“ اس نے سر ہلایا۔ ”یہ آپ کس لئے پوچھ رہے ہیں؟ میں تو
انسانوں کا شکاری ہوں۔“

”آپ اس لئے انسانوں کا شکار کرتے ہیں کہ آپ کو انسانوں سے زیادہ جانوروں
سے محبت ہے۔“

”اس بات سے مجھے انکار نہیں۔“

”کیا کسی شکاری سے آپ کی ذات کو اس قدر شدید نقصان پہنچا ہے کہ آپ اس کا
شکار اور اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرنے پر مجبور ہو گئے۔“

”میں آپ کو شکاریوں سے اپنی شدید نفرت کی وجہ بتاؤں۔“ اس کا چہرہ تھمتانے
لگا۔ ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ بے زبان اور معصوم جانوروں پر گولیاں چلاتے ہیں۔
ان کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کا دور تک تعاقب کر کے ہارتے ہیں ان کی آزادی اور بچپن و
سکون کی زندگی کو تھمہ دہا کر دیتے ہیں۔ کیا انہیں بے حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بھی انسانوں
کی طرح ایک بے سکون زندگی گزاریں۔ مجھے اس لئے شکاری ایک آنکھ نہیں بھاتے ہیں۔
اس لئے میں نے انہیں اس دنیا سے نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔“

”آپ ایک مذہب اور شناخت آدمی ہیں لیکن معصوم اور بے گناہ انسانوں کے
ساتھ ہمدردی سلوک کرتے ہیں جو آپ کو ذہیب نہیں دیتا۔“ میں نے تیز و تندہی سے کہا۔
”کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں ہے کہ آپ کو جانوروں پر رحم آتا ہے، انسانوں پر
نہیں.....؟“

”مجھے انسانوں پر ترس اس لئے نہیں آتا کہ اس سے بڑا دندہ اس کو کھا ارض پر
کوئی نہیں۔“ وہ جذباتی ہونے لگا۔ ”میں آپ کو انسان کی درندگی کے ایک نہیں بلکہ ایک
ہزار ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے جنگ کی مثال لیں اس جنگ کو کس نے جنم دیا؟
کیا انسان کے ہاتھوں سے اسے جنم نہیں دیا؟ آج دنیا کا سوا ایسا خطہ ہے جہاں انسان
آہیں میں جنگ نہیں لڑ رہا، وہ وحشی نہیں بنا ہوا۔ دنیا میں جتنے سنگین تہذیبی جرائم ہو رہے
ہیں ان میں سب سے سنگین جرم جنگ ہے۔ کیا آپ ان جانوروں کی ایک ایسی جنگ بھی بتا
سکتے ہیں جس سے انہوں نے انسانوں یا انسانی قوم میں تباہی پائی ہو۔ جانور تو جنگوں میں
مذہب انسانوں کی طرح رہتے ہیں انہیں جو سکون اور چین نصیب ہے اس سے آج انسان
محروم ہے۔ کیا انسان اس لائق ہے کہ اسے بخش دیا جائے؟“

”ہر کیف.....“ آپ انسانوں کو شکار کرنے کا سلسلہ آج سے ختم کریں۔ یہ
میرا اعلان مشورہ ہے۔“

”کیا کیا.....؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا، میں اس سلسلے کو ختم کر دوں جو دنیا
میں بالکل نیا اور نوکھا سلسلہ ہے۔ اس انوکھے شکار کا سرا میرے سر ہے۔ کیا آپ یہ بات
پورے دوش سے بتا سکتے ہیں کہ شکاری تاریخ میں کسی نے ایسا دلچسپ اور سنسنی خیز شکار
کھلا وہ جیسا میں کھیلتا ہوں۔ میں نے شکار کے لئے جو جانور منتخب کیا ہے وہ سوائے میرے

ہو گا۔“

”ہاں.....“ ڈاکٹر ادیس نے اپنا سر ہلایا۔ ”ایک طرح میں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے لیکن مجھے اپنی موت کی پرواہ نہیں، میں موت سے نہیں ڈرتا کوئی شکاری موت سے خوفزدہ نہیں رہتا۔ ویسے اس شکار میں جو لطف آئے گا یہاں لطف میں ساری زندگی حاصل نہیں کر سکوں گا۔ مجھے اپنی فتح کی امید اس لئے ہے کہ آج تک مجھے ہتھیار کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔ شکار میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکا۔“

”آپ کس شکاری بات کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کی.....“ بیگم جمال نے جواب دیا۔ ”ادیس آپ کے ساتھ شکار کھیلے گئے، پہلے تو ادیس آپ کے ساتھ شکار کھیلنے کے موڑ میں نہیں تھے اس لئے نہیں کہ انہیں موت کا خوف ہے۔ وہ آپ پر آنکھوں کی تبدیلی کا تجربہ کر کے شکار کھیلنا چاہتے تھے مگر اب انہیں زیادہ تاخیر پسند نہیں اور پھر ڈاکٹر قدرت خدا اپنی فیملی کے ساتھ یورپ چلے گئے ہیں، معلوم نہیں وہ کب آئیں گے۔“

”میرا شکار کیا جائے گا؟“ میں نے اپنے سادے بدن پر ایک عجیب سی سنسنی محسوس کی۔ میں زبردستی مسکرایا۔ ”میں تاروں۔“

”آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟“ بیگم جمال کے ہونٹوں پر سے بھی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اس کے لمبے میٹھا سا رتھا تھا۔

”میرے محسوس کرنے کی مانند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔“ میں نے اپنی کے حسین چہرے پر اپنی نظرس مرکوز کر دی۔ ”یہ میرے صیاد کا حکم ہے کہ وہ میرا شکار کرے گا۔ میں اب تک شکاری رہا ہوں اور اب شکار میں کراہیک درندہ مفت شکاری کا مقابلہ کروں گا۔“

”آپ کو دردناک موت کے تصور سے کوئی خوف محسوس تو نہیں ہو رہا ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”موت سے میں نہیں ڈرتا ہوں اس لئے کہ اس کا ایک دن معین ہے۔ قدرت نے میری موت اس جنگل میں لکھی ہے تو میں لاکھ جتن کروں اس سے بچ نہ سکوں گا۔ نہیں تو پھر ڈاکٹر ادیس بھی میرا بال بیک نہیں کر سکتے؟“

”دیہیم دونوں میں سے کسی ایک کا یہ آخری شکار ہو گا۔“ ڈاکٹر ادیس نے کافی کا گھونٹ لیٹے ہوئے کہا۔ ”اس لئے کہ یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک

جزیرے کے کسی اور جنگل میں پایا نہیں جاتا اور پھر میں خاص طور پر جانوروں کے شکاریوں کے ساتھ شکار کھیلنا اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ خود بھی ایک شکاری ہوتے ہیں۔ شکاری کو شکار کرنے میں جو لطف آتا ہے عام آدمی کو نہیں ہے۔ بے چارے جانور اور ایک عام آدمی میں اتنی ذہانت نہیں ہوتی ہے۔ اسی لئے میں شکاریوں کو اغوا کرتا ہوں اور انہیں شکار بناتا ہوں۔ عام اور غیر شکاری آدمیوں سے میں بہت کم شکار کھیلتا ہوں اس کے لئے رامنو ہوتا ہے۔“

”یہ شکار نہیں قتل ہے ڈاکٹر!“ مجھے غصہ آگیا۔ ”یہ انسانوں کا ہیمنان قتل ہے، آپ اس بربریت اور درندگی کو شکار نام نہ دیں۔“

”جب انسان کسی جنگل میں دوسرے انسان پر فتح پاتا ہے۔ بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں تو آپ اسے قتل نہیں کہتے ہیں۔ اس قتل و غارتگری کو فتح کا نام دے دیتے ہیں۔“

”آپ کا یہ فلسفہ مجھے تامل نہیں کر سکتا ہے۔ قتل، قتل ہے۔ آپ کی سرشت میں درندگی داخل ہو چکی ہے۔“ میں کے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا خیال ہے کافی کا ایک اور دروہ ہو جائے۔“ ڈاکٹر ادیس نے میری بات کا ذرا بھی برا نہیں منایا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بیگم جمال کی طرف دیکھا۔ ”نورہ ڈارلنگ! تم اپنے خوبصورت ہاتھوں سے کافی بناؤ لاؤ لطف آ جائے گا۔ پلیز.....“

بیگم جمال اپنی جگہ سے اٹھی اور مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی تو اس نے کہا۔

”بحث و تمکار سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آپ کو کیا معلوم کہ انسانوں کے شکار میں کتنا لطف آتا ہے۔“

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ انسانوں کو شکار کرنے میں کیا لطف آتا ہے؟ ایک بدترین دشمنانہ فعل کو آپ کو لطف کا نام دے رہے ہیں؟“

”اس شکار میں لطف اس لئے آتا ہے کہ انسان سے زیادہ ذہین اور خطرناک دنیا میں کوئی جنس نہیں۔ آپ ایک شکاری ہونے کے ناتے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ شکار کا اصل لطف خطرناک شکار کو شکار کرنے میں ہوتا ہے۔“

ہم دونوں میں بحث کا سلسلہ جاری تھا کہ بیگم جمال تین کب کافی بنا کر لے آئی۔ جب ہم کافی پینے لگے تو بیگم جمال نے کہا۔ ”ڈیڑا ادیس! اس مرتبہ تم نے جس شکار کا انتخاب کیا ہے وہ دنیا کا سب سے خطرناک ذہین اور ہوشیار شکار ہے۔ اس سے تمہارا مقابلہ بڑا سخت

شکاری کتا میرے کمرے کے دروازے کے باہر بیٹھا تھا۔ وہ آہٹ پاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور مجھے دیکھتے ہی غرائے لگا۔ میرے سارے بدن پر سنسنی دوڑ گئی۔

میں نے کھڑکی کے پاس جا کر پردہ ہٹا کر باہر بھانک تو گھٹات اور راستوں کی بتیاں بند ہو چکی تھیں۔ خاموش قضا اند میرے کمرے کی چادر تان کر سو رہی تھی۔ ایک میں تھا جو جاگ رہا تھا۔ اور شاید غم السار جاگ رہی ہوگی۔ پھر میں بستر پر بیٹھ گیا اور دماغ کے اشتہار پر قابو پا کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ آج میں پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اپنی زندگی میں کبھی ایسے بدترین حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ وہ درندہ صفت شخص میرا شکار کر کے میرا گوشت بھون کر کھا جائے گا۔ میں ایسی دردناک اور ہیما کی موت سے دوچار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس بے رحم سنگ دل اور وحشی شخص کے جتنے کسی قیمت پر چڑھتا ہوں چاہتا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں سے مرنے کے بجائے ڈوب کر مرنا اوارا تھا۔ پھر اپنی آزادی خودی حاصل کرنا ہو گی۔ اس بے ضمیر اور تنگ انسانیت شخص کو کسی نہ کسی طرح قانون کے حوالے کرنا ہو گا۔ جب تک وہ پھانسی پر نہیں لٹک جائے گا اس وقت تک مجھے جین نہیں آئے گا۔ نہ صرف اس غیبت سے بلکہ اس کے ایک ایک ساتھی سے انتقام لینے کے لئے مجھے زندہ رہنا ہو گا۔ ان سب کی وجہ سے نہ جانے کتنے بد نصیب یہاں پہنچ کر اس کی درندگی اور بربریت کا نشانہ بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔

یہ باغیانہ خیالات میرے دماغ میں آندھیاں بن کر میرے وجود کو جیسے حس نفس کر رہے تھے۔ میرا دماغ ایسا ہو رہا تھا جیسے چولے پر چڑھی کیتلی جس میں پانی ٹھکان رہا ہو۔ میں نے دل میں تیر کر لیا تھا کہ میں اس شیطان مردود کی قید سے نکل کر رہوں گا۔ میں اپنی جیتی زندگی اس جنگل میں ایک بھجڑیے کے ہاتھوں ضائع نہیں کروں گا۔..... فرار کے منصوبے کے لئے مجھے سرتا جیسے ایک قلعہ ساتھی کی ضرورت تھی۔ میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے دنوں کے بعد میرے ساتھ شکار کھائے گا۔

میں ایک گھنٹے تک سوچتا رہا کہ یہاں کے اپنے ساتھ ملاؤں اور اس پر بھروسہ کروں۔ اسے اپنے اعتماد میں لوں۔ رامو تو اس غیبت کا بخنجر نظر تھا۔ بیگم جمال اس کی دوست، محبوبہ اور دست راست تھی۔ ایک مرتبہ اس سے میں فریب کھا چکا تھا۔ اب اسے اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ بانی کے سوا کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بانی..... میرے ذہن میں ایک کوہ اسپاکا۔ ہاں بانی کو اعتماد میں لیا جا سکتا ہے۔ بانی بھی سرتا جیسی ہی بد نصیب لڑکی ہے۔ اسے ٹولنے سے کچھ تو اندازہ ہو جائے گا۔ بانی کے خیال

فریقین میں سے کوئی موت کے منہ میں نہیں چلا جاتا۔ یہ مقابلہ نہ صرف خطرناک اور بے حد دلچسپ ہو گا بلکہ بے حد سنسنی خیز بھی؛ دنیا کے دو چوٹی کے شکاری ایک دوسرے کو شکار کریں گے۔ کیوں مسٹر سالار! آپ کا خیال کیا ہے؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

میں نے اپنی کافی کا آخری ٹھونٹ لے کر گھ گھٹاتی پر رکھ دیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس سخت مقابلہ میں دو شکاری در مقابل ہوں گے۔ میں ابھی سے سوچ سوچ کر سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔“

اسی وقت بانی کمرے میں داخل ہوئی تو زاکر او ایس نے مجھ سے کہا۔ ”مسٹر سالار! آج آپ بہت تھکے ہوئے ہیں اب آپ جا کر آرام کریں۔ صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہو گی۔ آپ بانی کے ساتھ جائیں وہ آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دے گی۔“

میں ان دونوں کو شب بخیر کہہ کر بانی کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچا۔ ابھی مجھے پکرنے میں پہنچا کر ٹپٹی گئی۔ میرے بستر پر سیلینگ سوٹ تھا، بوا کھا میں کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ گو میں بے حد تھکا ہوا تھا اور بستر پر ہی بے حد آرام وہ تھاکر تندرست آٹھوں سے کوسوں دور تھی۔ میرے تصور میں غم السار کا چہرہ ابرائے لگا۔ وہ غم السار جو میرا خواب اور میری منزل تھی۔ میری محبت اور میرے وجود کا جزو نہیں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کا خیال مجھے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ وہ میری نہ اسرار کشدگی سے کتنی پریشان ہو گی اس کا مجھے احساس تھا۔ اس نے میری یاد میں رد و رو کر ہر حال کر لیا ہو گا۔ اس کا بچپن و سکون غارت ہو کر رہ گیا ہو گا۔ وہ بے آب و ہوا کی طرح میرے انتظار میں تڑپ رہی ہوگی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے کس قدر جان لیوا اور اذیت ناک ہو گا۔ کیا میں اس سے مل سکوں گا۔ اسے پاس کروں گا۔ اس درندہ صفت شخص سے بچ کر میں یہاں سے جا سکوں گا۔ مجھے یہاں سے ہریت پر نکل جانا ہو گا۔ مجھے یہاں سے کس طرح رہائی مل سکتی ہے؟

میں یہاں سے فرار کے بارے میں تدبیر سوچنے لگا۔ یہاں سے فرار ہونا اس قدر آسان نہیں تھا یہاں شکاری کتنے تھے اور اس کے علاوہ بہت سارے بد معاش بھی تھے اور پھر میں یہاں کے محل وقوع سے واقف بھی نہیں تھا۔ جب تک میں ہر قسم کی معلومات حاصل نہ کر لوں اس وقت تک میرے لئے بہت مشکل تھا کہ فرار کا منصوبہ بناسکوں۔

میں بے چینی سے بستر پر اس طرح کروٹیں بدلتا رہا جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ میں تھوڑی دیر تک کمرے میں ادھر ادھر مفلتا رہا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا کر مجھے دوسرے ہی لمحے دروازہ بند کرنا پڑا اس لئے کہ راہدار اسی میں دلچسپاقت

سے میرے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے اور میں اس طرح سے فریٹس ہو گیا جیسے اس نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا ہو۔

میں بستر پر سوئے کے لئے لیٹا ہوا تھا کہ میں نے کمرے کے باہر بہت ہلکی سی آواز سنی۔ ایسے لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد میرے کمرے کا دروازہ بے آواز کھلا۔ چونکہ میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں اس لئے میں نے دروازہ کھلنے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اچھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بالی تھی۔ جو میرے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

بالی دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی۔ کمرے میں زیرِ پا در کالجب چل رہا تھا۔ ”آپ جاگ رہے ہیں مسٹر سالار“

”یقیناً میں کیس نیند آئی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پریشان کن خیالات مجھے سوئے نہیں دے رہے ہیں۔“

”حیرت ہے آپ کو نیند اب تک کیوں نہیں آئی؟“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔“

”آپ نے غلط سن لیا۔“ میں نے اسے جھٹکنے کے لئے کہا تو وہ بستر پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ”اچھا ایک بات تو بتائیں کہ آپ کے خبیث ہاس نے مجھے اس قدر شاعرانہ کمرے میں کس لئے ٹھہرایا ہے جبکہ میں اس کا خطرناک ترین دشمن ہوں۔“

”وہ صرف شکاریوں کو ایسے کمرے میں ٹھہراتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ انہیں تین دن تک کسی شاہی صمان کی طرح رکھتا ہے۔ عمدہ کھانے کھلاتا ہے۔ ان کی ہر قسم کی خواہش پوری کرتا ہے۔ اگر آپ اس سے بیگم نقدہ جہاں، مجھے یا کسی بھی لڑکی کو جو اس جزیرے پر ہے، طلب کریں گے تو انکار نہیں کرے گا۔ وہ شکار کا عید قرباں کے جانور کی طرح خوب خیال رکھتا ہے تاکہ شکار تندرست و توانا ہو جائے اور شکار کرنے میں لطف آ سکے۔“

”آپ اتنی رات گئے میرے کمرے میں کس لئے آئی ہیں؟ کیا اس نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے۔“

”جی نہیں۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ ”میں خود چوری چھپے آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”اگر آپ کے پاس کو یہاں آنے کی خبر ہو گئی تو آپ کا کیا مشورہ ہو گا۔“

”آپ اس کی فکر نہ کریں، میرے پاس سو بہانے ہیں۔ اسے بیگم جمال سے ہی فرصت نہیں۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”اچھا تو آپ اس وقت میرے پاس کس لئے آئی ہیں؟ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں..... میں اس لئے آئی ہوں کہ آپ کو مشورہ دوں کہ آپ اس کے ساتھ شکار کا کیلن نہ کھیلیں بلکہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو جائیں۔“

”آپ کے اس مشورے کا بہت بہت شکریہ.....“ میں ممنونیت سے بولا۔

”میں بھی اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔“

”خدا کرے آپ یہاں سے بچ نکل جائے میں کامیاب ہو جائیں اور یہ شیطان کفر کردار کو پہنچے۔“

”کیا یہاں سے آج تک کوئی بچ نکلے میں کامیاب نہیں ہو سکا.....؟“

”یہاں سے صرف ایک شخص فرار ہوا ہے میں کامیاب ہو سکا تھا۔“ وہ کہنے لگی۔

”اس کے یہاں سے فرار ہونے میں میرا ہاتھ تھا۔ میں نے اس کی قدم قدم پر مدد کی تھی..... اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زخمہ سلامت یہاں سے بچ نکلا تو سیدھا پولیس کے پاس جا گئے گا..... پولیس کو جزیرے اور یہاں کے حالات کے بارے میں بتائے گا اور بد نصیب لوگوں کو رہائی دلائے گا مگر وہ اس جہم سے نجات پا کر ہم سب کو بھول گیا..... میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ایک شخص اس قدر خود غرض بھی ہو سکتا ہے۔“

”کوئی بات ایسی ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے وہ شخص قانون کی مدد حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو گا..... اس شخص کا نام کیا تھا؟“

”مشتاق چوہدری.....“

”مشتاق چوہدری.....؟ وہ تو وفات پا گئے۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”وہ اپنے گھر کسی نہ کسی طرح پہنچے تو گئے تھے لیکن اس حالت میں کہ وہ زخموں سے چور تھے..... موت نے انہیں اتنی مسلت بھی نہیں دی کہ وہ کچھ بتا سکیں۔ ان کی موت میری نظروں کے سامنے ہوئی تھی۔ وہ صرف اتنا بتا سکے تھے کہ ایک انسانوں کا شکار ہے..... وہ انسانوں کو بھون کر کھا جاتا ہے۔ مرحوم میرے دوستوں میں سے تھے۔“

”اوہ..... مشتاق چوہدری چل چکے.....“ بالی کی آواز میں دکھ بھر گیا

”اس خبر سے اس کے دل کو صدمہ پہنچا۔“ مجھے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی اس لئے

میں نے ان کے بارے میں غلط رائے قائم کی..... خدا مجھے معاف کرے۔“
”کیا آپ کے ذہن میں ایسا کوئی منصوبہ ہے کہ میں بھی مشتاق چوہدری کی طرح یہاں سے فرار ہو سکوں.....؟“

”میں آپ کو کل تک کچھ بتا سکوں گی۔“ وہ بولی۔ ”مشتاق چوہدری کے فرار کے بعد سے یہاں بہت سختی ہوئی ہے اس سختی کے باوجود کچھ قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ پہرہ داروں کی گولیوں یا شکاری کتوں کی درندگی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔“
”میرے ذہن میں فرار ہونے کی ایک تدبیر آ رہی ہے۔“ میں بولا۔ ”میں شکار کے دوران کھتے جنگل کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو سکتا ہوں۔“

”یہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”کیا آپ کے خیال میں وہ اس کمیل میں قتل ہوا..... ہرگز نہیں، وہ اتنا سبکدوش نہیں ہے کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ انسان کے شکار کے لئے اپنے ساتھ رامودار کتوں کو لے کر نکلتا ہے وہ اپنے شکار کو یہاں اندازے شکار کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے شکار جتنی تکلیف سے مرتا ہے، اسے اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے وہ اس کی تکلیف دیکھ کر خوشی سے رقص کرنے لگتا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ وہ کمیل کے منصوبے بنا رہا ہے اور اس دوران میں فرار ہو جاؤں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ فکر نہ کریں..... خدا ہماری مدد کرے گا..... کمیل میں ذرا یہاں کا محل وقوع دیکھ لوں پھر آپ سے مشورہ کر کے فرار ہونے کا منصوبہ بنائوں گا آپ کی مدد کی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔“

”مجھ سے جو تعاون ہو سکے گا وہ آپ سے کروں گی۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔
”مجھے اپنی ذات سے زیادہ ان بد نصیب قیدیوں کی فکر ہے جو ان درندوں کی درندگی کا نشانہ بننے والے ہیں..... ان کے لئے مجھے اپنی جان بھی دینا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہوں گی۔“

”مجھے سب سے پہلے اسلحہ وغیرہ کی ضرورت پڑے گی۔“ میں بولا۔ ”کیا ریو الوریا پستول، خنجر اور چاقو کا بندوبست ہو سکتا ہے۔“

”اس کا بندوبست کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کو جتنے ریو الوریا اور پستول کتنے لادوں گی یہاں ایسے خوفناک اور ذریعے شکاری چاقو ہیں کہ آپ نے دیکھے بھی نہیں ہوں گے یہ چاقو ڈاکٹر اور ایس نے خاص طور پر آرڈر دے کر بنوا رکھے ہیں۔“

”ٹھیک ہے اب آپ جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیوں ایسا نہ ہو کہ راموکیں جاگ جائیں اور آپ پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے۔“
”دن میں آپ کسی بھی جگہ پر اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہ کریں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”اتر کے ساڑھی کا پلو درست کرنے لگی۔“

”ہو سکے تو آپ کل رات اس وقت آجائیں میں آپ کا انتظار کروں گا۔“
”ایسا ممکن ہے کہ آپ یہاں سے فرار ہوتے وقت مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیں؟“ اس نے میری طرف اسی بھری نظروں سے دیکھا۔

”یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ خدا سے دعا کریں کہ اس المیہ کا میرے ہاتھوں خاتمہ ہو جائے اور ہم یہاں کی قید سے رہائی حاصل کر لیں۔ یہاں کوئی بد نصیب قیدی نہ رہے۔“

”آمین.....“ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے دل کی اتھاہ گھرائیوں سے کہا۔
دفعتاً بہت دور سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں تو میں نے ہائی کی طرف دیکھا۔
”یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟“

”کسی بد نصیب قیدی نے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔“ اس نے بتایا۔ ”موت اس کا استقبال کر رہی ہے..... ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ آخر آدمی کرے بھی تو کیا کرے اس غلامی سے تو موت ہی بہتر ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد پانی چلنے لگی تو میں سونے کے لئے ہسپتال گیا چڑو کترو ایس کے بارے میں سوچنے لگا جو انسانیت کی بیانیہ پر بد نما داغ تھا پھر اس شکار کے کمیل کے بارے میں جو ڈاکٹر مجھ سے کہتا تھا بتاتا تھا۔ ایک گھناؤنا مذموم اور قبیح کمیل، یہ انسانوں کا شکار نہ تھا بلکہ ایک طرح سے وحشیانہ قتل تھا ایک ایسا خوفناک کمیل جو درم کے اکھاڑوں میں ہوتا تھا۔ ان اکھاڑوں میں خون کے پیاسے اترتے تھے ایک خوفناک کمیل دو انسانوں کے درمیان شروع ہو جاتا تھا یہ کمیل اس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک کوئی سرتن سے جدا نہیں کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ تینتے قیدیوں پر کئی دنوں کے بھوکے پیاسے درندوں کا چھوڑ دیا جاتا تھا جو انسانوں کو چرچہ پھاڑ کے کھا جاتے تھے۔ اب یہی خوفناک کمیل یہ درندہ صفت شخص مجھ سے بھی کہتا تھا بتاتا تھا میں اسی لئے یہاں سے فرار ہونے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔

نہد نے مجھے اچانک اس طرح دبوچ لیا کہ خبر تک نہ ہو سکی میں دیر تک سو نہ رہتا اگر بالی مجھے نیند سے بیدار نہ کرتی وہ میرے لئے بیڈنی لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں ٹھیک نو بجے ناشتے کی میز پر جانے کے لئے تیار رہوں۔ وہ مجھے آکر لے جانے گی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے وہ بیڈنی تپائی پر رکھ کر علی گئی تو میں نے غسل خانے میں جا کر پانی سے کلی کی، کمرے میں آکر چائے لے کر کھڑکی کے پاس چلا گیا کھڑکی کے پڑے ہٹا کر باہر جھانک تو نظروں کے سامنے ایک دلکش نظارہ تھا سورج کی کرنیں چاروں طرف سونا لٹا رہی تھیں یوں بھی جاڑے کی صبح بہت حسین ہوتی ہے۔ سامنے دریا تھا جس کی لہریں سبک خراہی سے بہہ رہی تھیں۔ بائیں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا اس عمارت کے قریب گھاٹ تھا جس پر دو دریا بہت ترن لائیں اور چھ سات سوڑیوں کھڑی تھیں۔ ان لائچوں میں سے ایک لالچہ وہ تھی جس میں ہم لوگ گاؤں سے سوار ہو کر فرار ہوئے تھے۔ عجیب سی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر اوہس نے اپنے اس اوٹے کی تباہی بند اور جعفر کے قتل پر کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کا سرسری اندازہ بھی بتا کر دیا۔ دائیں طرف بہت دور اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا نظر آیا یہ جنگل تھا میں سے جنگل شروع ہوتا تھا اور میں نے ہمیں آس پاس کہیں نہ پایا تھی۔ میں اس عمارت کے محل وقوع کو ذہن نشین کرنے لگا۔

میں نے اتنا تو اندازہ کر لیا تھا کہ یہ عمارت حویلی نما ہے میں اس عمارت کی بالائی منزل پر ہوں یہ عمارت کئی کئی بلندیوں پر اس کی تعمیر بہت پیسہ خرچ کیا گیا تھا۔ اس کے پاس اس قدر دولت کہاں سے آئی، کیسے آئی مجھے اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ یہ ایک جہنمی درندہ تھا جس نے اپنی تحسین کے لئے اس جہیز سے پر اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی جس کی دنیا کو بالکل برباد تھی۔

ٹھیک نو بجے بالی مجھے لینے آگئی کمرے کے باہر شکاری دیو قامت کتا موجود تھا میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے اپنا منہ میری طرف بڑھایا میں نے پیار سے اس کے

سر پر ہاتھ بھیرا تو اس نے اپنی ناک میرے ہاتھ پر لگائی یہ ہم دونوں کی دوستی کا آغاز تھا میری نے اس کی گردن پر ہاتھ بھیرا تو وہ اپنی دم ہلانے لگا۔ ہم دونوں میں جیسے دوستی ہو گئی تھی۔

بالی نے میری طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔ ”آپ نے تو اسے بہت جلدی اپنا دوست بنالیا..... اس کا نام موتی ہے۔“

”جانور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ اعلیٰ نسل کا کتا ہے اعلیٰ نسل کے کتے جتنے خطرناک ہوتے ہیں اتنے ہی وفادار اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں ویسے یہاں کل کتنے کتے موجود ہیں؟“

”تم..... اس نے جواب دیا۔ ”ایک کتا تو رامو کا ہے جسے رامو ہر وقت ایک بہت بڑے بچے میں قید رکھتا ہے وہ کمرے سیاہ رنگ کا ہے بہت ہی زیادہ خوشنور اور خطرناک۔ وہ اس شکار کے وقت ساتھ لے کر نکلتا ہے۔ وہ اسے ٹانگیں کھتا ہے وہ بھی ٹانگیں کی طرح تھیرا کتا ٹوٹی ہے وہ بھی موتی جیسا ہی ہے اور صدر دروازے پر پہرہ دیتا ہے۔“

میں نے چھ سات قدم چلنے کے بعد رک کر موتی کی طرف دیکھا۔ موتی میرے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بلاتے ہوئے پکارا۔ ”موتی..... ادھر آؤ..... موتی!“

دوسرے لمحے موتی لپک کر میرے پاس آیا تو میں نے اسے سے کہتے ”شاباش بیٹھ جاؤ.....“

موتی نے میرے ہجیم کی قبیل کی تو بالی ششدر رہ گئی۔ ”نا قابل یقین..... میری اس سے دوستی ہونے میں دس دن لگے ہیں۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جانوروں سے دوستی کرنے کے فن سے ناواقف ہیں۔“ میں نے اس سے کہا۔

”اگر آپ ٹوٹی سے بھی دوستی کر لیں تو.....“ وہ سرگوشی میں بولی اور اس نے اپنا جملہ ادھر ادھر بھجوا دیا۔

میں اس کی بات کی تردید میں پہنچ گیا۔ ”میں کوشش کروں گا شرط موقع ملنے کی ہے۔“ میں بالی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو ہمیں بھال اور ڈاکٹر اوہس ناشتے کی میز پر میرے منتظر تھے۔ ڈاکٹر اوہس اپنی کرسی چھوڑ کر میرے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس

نے بڑی گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”مسٹر سار! رات آپ کو نیند آئی۔“
”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں بڑی گہری نیند سو رہا ہوں۔“ میں نے ہاتھ بیدار نہ کرتے ہوئے مطلع نہیں کتنی دیر تک سو رہا تھا۔“

”آپ واقعی بڑے بہادر اور مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔“ اس نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”آپ کی آنکھوں اور چہرے پر ہشاشت دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ ساری رات مزے سے سو رہے ہیں۔ گہری نیند سونا دلیر لوگوں کا کام ہے۔“
”گہری نیند سونے میں دلیری کا کیا دخل.....؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”میرے ہاں جو بھی شکاری ہمسار رہے ہیں وہ شکار کے کھیل کی دہشت اور موت کے خوف سے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکتے ہیں مگر آپ ان کے برعکس نکلے۔ کیا آپ کے دل کے کسی کونے میں ذرا سا بھی خوف دامن گیر نہیں ہے؟“

میں نے کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے اسے جواب دیا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا بلکہ موت مجھ سے ڈرتی ہے۔ ایک شکاری جب شکار پر جاتا ہے تو ایک طرح سے وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شکار کھیتا ہے کیوں.....؟“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ اس نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے بالی کی طرف دیکھا۔ ”بالی آؤ..... آج تم بھی میرے ساتھ ناشتہ کرو۔“
”شکریہ سرا“ وہ میرے برابر دالی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

میں نے بیگم جمال کے حسین چہرے پر ہانوا کی ایک کبیری دیکھی وہ بالی کی اس پذیرائی پر دل میں جل ہی گئی تھی۔ وہ اس وقت ہورے رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ کے بغیر آئین کے بلاؤ زمین لبوس تھی اس کے بال کٹے اور پٹ پر لہرا رہے تھے وہ اس لباس اور عالم میں بڑے غضب کی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بالی سے زیادہ حسین اور پُرکشش نہ تھی اس لئے جل رہی تھی۔ اسے شاید خدشہ تھا کہ کہیں بالی اس کی جگہ نہ لے لے۔

ڈاکٹر ادیس سرمئی رنگ کے عمدہ تراش کے سوٹ میں لبوس بڑا دھیمہ اور سادہ رنگ رہا تھا اس کی عمدہ جامہ زیبی نے اس کی عمر کو چھپا لیا تھا۔ اس نے ناشتہ شروع کرنے کے لئے کہا۔

”ناشتہ پُرکلف تھا اور اس کی مقدار آٹھ دس آدمیوں کے لئے کافی تھی۔“ ناشتے میں طوہ ”پوری“ آلو کی ”بجیا“ پر اٹھے ”فرانی قیہ“ ہاف فرانی اٹھے، پکن سوپ اور سلاٹس

بھی تھے ”سوٹ ڈش میں دس ملائی ٹکاپ جاسن اور دس گلے تھے۔“

میں نے ناشتے کے دوران اس سے دریافت کیا۔ ”آپ نے اس جزیرے پر جو یہ کھل بنایا اور اپنی حکومت قائم کی اس کے علاوہ لاکھوں ”مونروٹس“ اور بہت ساری چیزوں پر جو ٹکاپانی کی طرح بنایا ہے کیا یہ فضول خرچی اور ہانگل پن نہیں ہے؟“
”آپ کے خیال میں“ میں نے یہاں کتنی رقم ضائع کی ہوگی؟“ وہ میری بات سن کر مسکرا دیا تھا۔

”میں نے آپ کی یہ جگہ ٹھوم پھر کے کہاں دیکھی ہے جو جاسکوں بس ایک اندازے سے یہ بات میں نے کہی تھی۔“

”ناشتے کے بعد میں آپ کو اپنی مملکت کی سیر کراؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”میں نے اپنی اس مملکت پر اب تک کوئی دس کروڑ ٹکا خرچ کئے ہیں..... ماہانہ اخراجات پانچ سے سات لاکھ ٹکا ہیں۔“

”دس کروڑ ٹکا.....؟“ میرا منہ حیرت سے کھلا گیا۔ ”یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی.....؟ کیا آپ کے والد کروڑ پتی تھے.....؟“

”جی نہیں..... میرے ماں باپ تو بہت غریب آدمی تھے۔“ وہ جتانے لگا۔
”تین برس پہلے میں کراچی میں تھا میں نے ہیر دین کے دو تین ٹرپ کئے ہیں جنہیں کروڑ ٹکا کمائے پھر میں بنگہ دیں گیا۔“

”پانچ سات لاکھ ٹکا کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟“
”منشیات فروشی سے..... آج کل سب سے منافع بخش کاروبار بھی یہ ہے اس کاروبار میں“ میں ہانپہ بند رہے میں لاکھ ٹکا کما ہوں اور اس کی بدولت یہاں ایک پُرکلف اور خواب ناک زندگی گزار رہا ہوں۔“ اس نے بیگم جمال کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو وہ سرخ ہو گئی۔

”تو آپ سارے کام ہی غلط کر رہے ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کوئی نیک کام بھی کر رہے ہیں آپ؟“

”نیک کام میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ الٹی بدنامی ہی ملتی ہے ویسے دوا ایک نیک کام تو کرتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں ان لوگوں کے ساتھ نیکلی اور محبت سے پیش آتا ہوں جن کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ آپ بھی یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اسی دیکھیں میں ایک نہیں ہزاروں اور لاکھوں غریب جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتے

ہیں۔ جب بھی بڑے طوفان اور سیلاب آتے ہیں تو یہ غریب کتوں کی موت مرجاتے ہیں۔
ان کی بے گور و کفن لاشیں پانی میں تیرتی اور سڑتی رہتی ہیں۔“

”حیرت کی بات ہے..... آپ کو انسانوں سے محبت ہے اور ان کے ساتھ نیکی بھی کرتے ہیں۔“ میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ ”آپ محبت، نیکی اور انسانیت کے مضمون سے آشنا ہیں کیا آپ کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز ہے؟“

”میں ابھی چل کر آپ کو اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ میں کیسا درد مند انسان ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”رہی دل کی بات وہ میرے پاس ہے کہاں.....؟ اسے میں نے پیغمبر جلال کے پاس رہن رکھ دیا ہے۔“

جب ناشتہ کر کے اٹھے تو مجھے وہ اپنے ساتھ ایک بہت ہی بڑے اور آراستہ و عیاستہ کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ اس کا دفتر تھا جہاں اسی عمارت کے ایک حصے میں واقع تھا اور اس کی خوب گاہ کے قریب تھا۔ ایک بڑی اور خوبصورت سی میز تھی جس پر تین ٹیلیفون رکھے تھے جو مختلف رنگوں کے تھے دوسری طرف دو تین فائلیں تھیں ’ایئر لے اور فلدان بھی منبوجہ دتے ایک طرف سنیل کی الماری اور بہت بڑی تجو بھی تھی میز کے گرد چوہ کر سیاں ملا قاتیوں کے لئے تھیں ایک ریو الونگ چیز تھی جس پر وہ بیٹھا تھا۔

”یہ ہے میرا دفتر جہاں میں سے اپنے ساتھیوں کو احکامات جاری کرتا ہوں اور انہیں کنٹرول بھی کرتا ہوں۔“

”آپ کے آدمی آپ سے اس پتے پر رابطہ قائم کرتے ہیں؟“
”جی ہاں..... ان کے پاس میرے ٹیلیفون نمبر ہیں میرے جزیے میں ٹیلیفون کا ایک جال پھیلا ہوا ہے مجھے رتی رتی باتوں کی خبر ملتی رہتی ہے۔ دو آدمی جن کا کمرہ دوسری عمارت میں ہے وہ وہاں ہر وقت ٹیلیفون کے پاس موجود ہوتے ہیں کوئی بھی اہم بات ہو تو مجھے بغیر کسی تاخیر کے اطلاع مل جاتی ہے۔“
”کیا آپ کے پاس اپنے تمام آدمیوں کا ریکارڈ موجود ہے کہ کون کہاں ہے اور کس کام پر مامور ہے۔“

”جی ہاں..... نام اور پتے مع تصویروں کے..... ان کی فائلیں اس تجوری میں بند ہیں..... یہ آپ کس لئے پوچھ رہے ہیں۔“
”اس لئے کہ آپ پر فحش پانے کے بعد آپ کے گردہ کا قلع قمع کیا جاسکے۔“

”اوہ.....“ وہ چپکے لگا۔ ”آپ کو اپنی کامیابی کی بڑی امید ہے آخر یہ توقع کیونکر ہے؟“

”اس لئے کہ مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ ہے۔“
”خدا پر.....“ اس نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ”اس خدا پر جو انسانوں کا سب سے بڑا اور ازلی دشمن ہے۔ اسے انسانوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ دنیا کے لوگوں کو جس بے رحمی سے مارتا ہے اور غارت کرتا ہے اس پر آپ بھروسہ کر رہے ہیں۔“

”انسان خواہنے اعمال کے سبب تباہی و بربادی کی کھائی میں جاگرتا ہے ان کی تباہی کا وہ ذمہ دار نہیں ہوتا ہے وہ تو رحیم و کریم ہے جس نے بھی اسے معصیت میں پکارا اس نے مدد کی..... وہ انسان کو کبھی پاپس نہیں کرتا۔“

”آپ خدا پر بھروسہ کریں اور میں اپنے بازوؤں پر میں دیکھتا ہوں خدا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے۔“

”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ..... خدا کس طرح معصیت میں کام آتا ہے..... مجھے اس کی ذات پر بھروسہ ہے اور آخری سانس تک رہے گا۔“

”اس سے پہلے جو شکاری میرے مقابلے پر آئے تھے خدا نے ان کی مدد کرنے میں کی..... آخر وہ بھی تو معصیت زدہ تھے۔“

”انہوں نے خدا پر نہیں اپنے بازوؤں پر بھروسہ کیا ہو گا! ایہی معصیت میں اسے نہیں پکارا ہو گا۔“

”بہر کیف..... میں نے انہیں آپ کے خدا کے پاس بھیج دیا ہے..... آپ بھی وہاں جانے کے لئے تیار رہیں۔“

”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“
”پوچھیے۔“

”میں نے سنا ہے کہ آپ آدم خور ہیں..... انسانوں کا گوشت پکا کر اور بھون کے کھا جاتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟“

”یہ بات بالکل سچ ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”انسان کا گوشت جتنا لذیذ اور مزیدار ہو تا ہے اتنا کسی بھی جاندار کا نہیں ہوتا ایک بار منہ کو لگ جائے تو پھر چھوٹنا ہی نہیں۔ میں نے سب سے پہلے انسان کا گوشت افریقہ کے ایک جنگل میں کھایا تھا میرے افریقی بھائی نے مجھے

دھوکے سے کھلا دیا تھا۔

”آپ وہیں رہ جاتے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”وہاں کے آدم خوروں میں ایک اور آدم خور کا اضافہ تو ہو جاتا۔“

”اگر میں وہاں رہتا تو میرا میزبان ہی مجھے کھا جاتا اس لئے میں وہاں سے چلا آیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

میں مسکرایا۔ ”اگر ایسا ہو تا تو اس افریقائی کا انسانیت پر بہت بڑا احسان ہوتا۔ آج یہاں کے لوگ آپ کی درندگی کا نشانہ تو نہیں بنتے۔“

”آپ ایک مرتبہ انسان کا گوشت کھا کر تو دیکھیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پھر آپ بھی میری طرح آدم خور بن جائیں گے۔ کیا خیال ہے آج کی رات رات کے کھانے میں اس کا اہتمام کرادوں..... رابو بھی بڑے شوق سے اور رغبت سے انسان کا گوشت کھاتا ہے۔“

”کیا انسان کو انسان کا گوشت کھانا زیب دیتا ہے۔“ میں نے اس کی طرف غارت سے دیکھا۔ ”مجھے تو آپ معاف رکھیں۔“

”کیا آج کل انسان انسان کو نہیں کھاتا؟“ وہ بڑے اطمینان سے کہنے لگا۔ ”اگر میں بھی انسانوں کو کھاتا ہوں تو کوئی جرم تو نہیں کر رہا۔ کیا بڑی چھٹی چھٹی کو نگل نہیں جاتی؟ کیا بڑی اور مذہب قومیں چھوٹی اور پسماندہ قوموں کو معاشی اور اقتصادی طور پر ہڑپ نہیں کر رہی ہیں اور ان کا خون چوس چوس کر انہیں مار نہیں رہی ہیں؟ اگر میں ان کے نقش قدم پر چل رہا ہوں تو اس میں حیرت اور غارت کی کیا بات ہے؟“

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر دفتر کے کمرے سے نکلا چند قدم پر ایک کمرہ تھا جس کے سامنے پہنچ کر رک گیا اس کمرے کے دروازے پر ایک خوبصورت سیاہ لٹک کی تختی نصب تھی جس پر ”لابریری“ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ دروازے پر تالا تھا وہ اپنی جیب سے چابیوں کا کچھلا نکالنے ہوئے ہوا۔ ”مسٹر سالار! میں آپ کو آپ کے ہم پیشہ، ہم ذوق دوستوں سے ملاتا ہوں۔“

”کیا آپ نے انہیں یہاں قید کر رکھا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”قید نہیں کیا ہوا ہے۔“ اس نے تالا کھولتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں اس کمرے کی مینٹ بنا کر رکھا ہے میں انہیں روز دیکھتا ہوں اور ان سے ملتا ہوں۔ آپ بھی ان سے مل لیں پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔“

اس نے کمرے کا دروازہ کھولنے کے بعد مجھے کمرے میں داخل ہونے کی دعوت دی میں کمرے میں اس کے پیچھے پیچھے داخل ہوا یہ ایک ہال نما کمرہ تھا اس میں لکھنے پڑھنے کی میز کے علاوہ الماریاں اور شیفٹ بھی تھے جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اسے مطالعہ کا حقد سے زیادہ شوق تھا۔ میں نے کمرے کا پوری طرح جائزہ لیا تو میرے سارے بدن میں وحشت کی لہر تھجکی طرح کا تھکی ہوئی آرتھریٹس میں غش سا کھائیگا۔

میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اس قدر لرزہ خیز وحشت ناک اور بھیماک منظر نہیں دیکھا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہوں۔ اس کمرے کی دیواروں پر چھادوں طرف انسانی سرسجے ہوئے تھے۔ میں ان سروں کو خوب اچھی طرح پہچانتا تھا ان سروں میں کئی سرو تو میرے شکاری دوستوں کے تھے۔ صرف دو تین چہرے میرے لئے نا آشنا تھے۔

میں دیوار کا سارا نہ لیتا تو اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگی تھی۔ ایکایک رہا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر رڈوب رہا ہو سینے میں وحشت اور خوف سے دھک دھک سی ہونے لگی تھی۔ جسم کا سارا خون جیسے نچوڑ لیا گیا تھا میں نے بڑبڑا کر اس کے سارے کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بھیماک نظارہ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

”یہ ہیں آپ کے شکاری دوست..... اس کی استہزائی آواز میرے کانوں میں سیسہ بن کر کھینچنے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف متنی خیز انداز سے مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ”ان سروں میں صرف آپ کے ایک سر کی کپی رہ گئی ہے؟ آپ کا اسرار کمرے میں بچ جائے تو میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہوگی اس لابیئر کی میں چار چاند لگ جائیں گے۔“

میرے لئے یہ نظارہ دیکھنا اور پیروں پر کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا اور میرا جی باش کرنے لگا تو میں کمرے سے نکل آیا وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آیا اس نے دروازے پر تالا لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج شام تک بے جاش دھ کا سر بھی آج آجائے گا۔“

”آج کے مذہب دور میں آپ جیسا شقی القلب شخص کوئی نہیں ہو گا۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یہ انسانی سر آپ نے کس لئے ہمارے ہیں؟“

”یہ انسانی سر دراصل میرے عظیم کامناہوں کے ثبوت ہیں۔“ وہ فخر سے بتانے لگا۔

”فکار کے کھیل میں“ میں نے انہیں زبردست شکست دی۔ مجھے تو حیات آسانی سے حاصل

نہیں ہوئی ہیں۔ اس نے زبردست محرکہ آرائی ہوئی۔ میں بھی موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ بچا ہوں۔ یہ سرنہیں ہیں یہ تو میری بھاری کے تھے جن میں نے یہاں سہارا رکھا تھا۔ اب مجھے ایک سب سے بڑا تھن اور حاصل کرنا ہے جس کی مجھے بڑی تنہا ہے۔

”وہ کون سا تھن ہے؟“ میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”آپ کا سر..... ایک عالمی شہرت یافتہ شکاری کا سر..... اس کا حصول میری زندگی کا سب سے بڑا اور عظیم کارنامہ ہو گا۔“

”خدا کے لئے اب تو آپ انسان بن جائیں ڈاکٹر اویس!“ میرے سارے بدن پر جھرجھری سی آگئی۔ ”انسان کو انسان ہی رہنا چاہئے۔“

”آپ کو میں اپنا ایک اور عظیم کارنامہ دکھاؤں جو دنیا میں آج تک کوئی انجام نہیں دے سکا۔ میرے ساتھ آئیے.....“ اس نے میری بات سنی ان کی سرکری۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اس عمارت سے باہر آئے۔ یہ عظیم و شان عمارت میرے اندازے کے مطابق کسی محل کی طرح تھی۔ اس عمارت کے عقب میں ایک اور عمارت تھی جو کسی اسکول کی عمارت سے مشابہہ تھی۔ اس کے نیچے اور اوپر بہت سارے کمرے بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے اس عمارت کی طرف لے کر بڑھا۔

اس عمارت کے باہر ایک مسلح شخص پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے مستعد ہو کر سلام کیا۔ اس عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی وہ ایک کمرے کے سامنے رگ گیا جس کے اندر سے کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا جوٹو کا کارخانہ تھا۔ اس میں پانچ چھ او جیز عمر کے آدمی جو بنائے اور ان کی سلائی کرنے میں مصروف تھے۔ ایک الماری میں جوٹوں کی آٹھ دوں جوڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں چڑے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے رکھے تھے۔

ان آدمیوں میں سے دو ایک نے اپنا سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور اپنے کام مصروف ہو گئے۔ ان کے چہرہ پر گہری ادا سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مریضوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر اویس الماری کے پاس جا کر رکھا اور ان سے جوٹوں کی ایک جوڑی نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ ”آپ نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے جوٹے دیکھے ہیں؟“

میں نے جوٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بڑے نفیس جوٹے بالکل ایسے ہی تھے جو میرے ایک مداح نے مجھے تحفے میں دیئے تھے جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ برما کے ایک جانور کی کھال کے بنے ہوئے ہیں سب سے قیمتی بھی تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میرے پاس

کبھی ایسے ہی جوٹوں کی ایک جوڑی ہے جو میرے ایک مداح نے تحفے میں دی تھی۔“

”اچھا.....“ وہ مسکرایا۔ ”وہ جوٹے بھی اس کارخانے کے بنے ہوئے ہیں۔“

”میں نے سنا کہ جو شخص سال میں ایک مرتبہ یہ جوٹے لے کر فروخت کرتا ہے وہ بڑا بڑا آدمی ہے۔“ میں بولا۔ ”یہ کس بڑی جانور کی کھال کے ہیں۔“

”یہ ہم نے کسی وجہ سے ایسا مشہور کر رکھا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ جوٹے صرف اور صرف میرے کارخانے میں بنے ہیں۔ یہ جوٹے کسی جانور کی کھال کے نہیں ہیں، انسانی کھال کے بنے ہوئے ہیں.....“

”انسانی کھال کے.....“ جوٹے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑے۔

”سو فیصد انسانی کھال کے جوٹے ہیں۔“ اس نے جبکہ کر فرش پر سے جوٹے اٹھا لئے۔ ”انسانی کھال سے جوٹے بنانے کے بارے میں میرے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آیا۔ پھر میں نے اس مقصد کے تحت ایک ٹیٹری قائم کی۔ پھر ان کارمیکروں کو ٹکٹے سے ڈھکے اور فریب سے لاکر یہاں قید کرنا پڑا۔ یہ چھ آدمی ٹیٹری کے کام کے علاوہ جھٹ مازی کے بھی ماہر ہیں۔ ان کی صلاحیت قابلیت اور مہارت کی وجہ سے انسانی کھالوں کے جوٹے بننے لگے۔ دنیا کے کسی گوشے میں انسانی کھال کے جوٹے بننے ہیں اور نہ کوئی بنا سکتا ہے۔ یہ اعزاز بھی مجھے حاصل ہے۔“

مجھے اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا مگر یہ ایک تلخ اور انتہائی بھیاں یک حقیقت تھی۔ یہ انسانی کھال ہی سے بنے ہوئے جوٹے تھے۔ ایسی لاطین نفس اور خوبصورت کھال کسی جانور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تھوڑی دیر تک ایک جگہ دم جوٹو کھڑا پھٹی پھٹی نظروں سے اس کارخانے کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک طرف مختلف رنگوں کی کھالوں کا ڈھیر تھا، یہ کاریگر تھے جو بڑی مشاقی اور مہارت سے جوٹے بنا رہے تھے اور سلائی کر رہے تھے۔ جوٹے الماریوں میں بچے ہوئے تھے۔

”اتنی انسانی کھالیں آپ کو کہاں سے مل جاتی ہیں.....؟“ میں نے تھیر زرد لہجے میں پوچھا۔

”کیا اس دیس میں انسانوں کی کوئی کمی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”سیلاب اور طوفانوں میں جو لوگ مر جاتے ہیں جن کی لاشیں غریبوں اور دیوانوں میں پھینک دی جاتی ہیں اس

۲۰۴ء۔ انہیں اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اگر بچ کر نکل سکتے ہیں تو نکل جائیں۔ اب تک کوئی شخص ایسا خوش نصیب نہیں نکلا جس نے یہاں سے نجات حاصل کر لی اور اور اپنے گھر پہنچا۔

اس کے ساتھ جو کمرہ تھا اس میں دو مسلح شخص بیٹھے تاش کے کھیل اور کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کمرے کی ایک الماری میں بہت سارے چاقو، پھریاں اور پھرے رکھے تھے۔ یہ وہ مال تھا جو لالچوں اور ستیروں سے حاصل کیا گیا تھا یہ دونوں شخص اس قمارت کے گمراہ تھے۔ دوسری الماری میں بندوقیں اور درخشاں جلیجی تھیں جو ان پر نصیب شکاریوں کی تھیں جو اس کا شکار رہے تھے۔

کوئے میں جو کمرہ تھا وہ سب سے بڑا تھا اور یہ بھی ایک جیل خانہ ہی تھا۔ اس میں لاکیاں اور عورتیں بند تھیں جن کی عمریں بارہ سال سے لے کر تیس برس کی تھیں۔ وہ بے حد فلکیں، متوحش، پریشان اور مرنے والے ہوئے چھوٹوں کی طرح لگ رہی تھیں پھر بھی ان کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان میں جو لڑکیاں اور عورتیں تھیں جن کی قیدی تھیں ان کی حسین آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں جیسے ساری آلات روتی رہی ہوں۔ وہ سب کی سب بے بس ہریوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں جیسے غم بخشنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان پر نصیب لڑکیوں اور عورتوں کو کچھ کر میرے دل کو کمرے صدمے کا سا احساس ہوا۔

جب ان لڑکیوں اور عورتوں نے ہم دونوں کو دیکھا تو ایک ایک کر کے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ سلاخوں کے پاس آکر انہیں پکڑ کے کھڑی ہو گئیں۔ ان کے چہرے نفرت اور غصے سے تھماٹھے تھے اور آنکھوں سے فٹلے برسنے لگے تھے۔ ان میں دو نین لڑکیاں ایسی تھیں جو اس سے منت سناہت کرنے لگی تھیں کہ وہ انہیں اس جہنم سے آزاد کرے۔ باقی لڑکیاں اور عورتیں اسے بدعنائیں دینے لگیں۔ ان کا اس چناؤ وہ اس غیبت کے کلرے کلرے کردہتیں۔ وہاں چند لمحے کھڑے رہنا بھی دودھ بھر دے لگا تھا۔

پھر وہ مجھے اس کمرے اور قمارت سے لے کر باہر لایا۔ اس نے دفتری طرف واپس جاتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکیاں اور عورتیں اس کی دل بھگی کے لئے ہیں۔ بیکم جمال جب منشیات کی خرید و فروخت اور کسی مشن پر چل جاتی تو ہے ان میں سے کوئی اس کی جگہ لے لیتی تھی۔ اس نے ایسی لڑکیوں اور عورتوں کو جو بد صورت اور بے کشش تھیں انہیں دوسرے کمرے میں بند رکھا تھا اور وہ اس کے ساتھیوں کی خدمت کے لئے وقف تھیں۔

وقت ان لاشوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ یہ یزبن ہوتا ہے انسانی کھالوں کے حصول کا پھر یہ مشین سے انسان کی کھال کو اتار لیتے ہیں۔ پھر یہ کھالیں ٹیڑی میں پٹی جاتی ہیں۔ میں نے اس مقصد کے لئے ایک جدید ترین پلانٹ لگا رکھا ہے۔ کیا آپ یہ دیکھنا پسند کریں گے جس سے کھال کس طرح اتاری جاتی ہے؟

”جی نہیں.....“ ایک سرورلر میری ریڈھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ ”بالفرض محال یہ کھالیں ختم ہو جاتی ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں؟ طوفان اور سیلاب ہر سال نہیں آتے ہیں اور ایک سال کا عرصہ درمیان میں ہوتا ہے۔ کیا کھالیں ختم ہونے پر سیلاب اور طوفان کا انتظار کیا جاتا ہے؟“

”جی نہیں.....“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ”میں اور رامو ہر دو ایک دن میں انسانوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ روزی شکار کھانا پڑتا ہے۔ لہذا کھالوں کی کوئی کمی نہیں رہتی ہے۔ کھالیں جو تے بناتے اور گوشت، تیرے اور رامو کے کام آجاتا ہے۔ آپ کے دوست شکاریوں کی کھالوں کے جو تے بھی بن کر فروخت ہو چکے ہیں۔ میں اپنا مال غیر ممالک بھی بیچتا ہوں۔ یہ ایسا منافع بخش کاروبار ہے کہ کیا بتاؤں۔ یہ جو تے بڑے بڑے لوگ منہ لگتی قیمت خریدتے اور بیٹے ہیں۔“

”کیا یہ جو تے خریدنے والوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ انسانی کھال سے بنے ہوئے ہیں؟“

”جی نہیں.....“ وہ بولا۔ ”اگر بتا دیا جائے تو پھر ان جو توں کا فروخت ہو جائید ہو جائے اور شامت آجائے۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ خلع کر دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں دو تین ادھیر عمری عورتیں بیرونی کی پڑیاں بنا کر انہیں ایک بہت چھوٹی پلاسٹک کھلی میں پیک کر رہی تھیں۔ اس نے بتایا کہ یہ بیرونی ہے جو کراچی سے لائی جاتی ہے اور یہاں سے بھارت جاتی ہے۔ اس کے آوی سنگاپور اور ہانگ کانگ وغیرہ بھی لے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی منشیات ہی سے ہوتی ہے۔

پھر تیرے کمرے میں پہنچے تو یہ ایک جیل خانہ تھا یہ کمرہ بال نما تھا اور لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ اس میں کوئی چالیس پچاس کے قریب قیدی ہوں گے۔ ان میں بیس سال سے لے کر چالیس برس تک کی عمر کے مرد تھے۔ ان کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔ اس نے بتایا کہ ان میں سے روزانہ دو تین مردوں کو شکار کے کھیل کے لئے منتخب کیا

اور گولیاں بھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں سے فرار کا منصوبہ بنانا بہت مشکل ہے۔ فرار کی ایک ہی صورت ہے کہ شکار کے دوران جنگل ہی سے فرار ہونے کی کوشش کروں۔ یہاں میں جنوب میں درختوں کے بیچ ایک کنیا ہے۔ اس کنیا میں اگر کوئی آدمی موجود ہے تو اس کا مطلب ہے ہوا کہ دریا کے کنارے کوئی موزیوٹ کھڑی ہے۔ ویسے اس کنیا میں ایک آدمی ضرور ہوتا ہے اس لئے کہ اگر کوئی شکار افاق سے پچتا پچاتا دھڑاٹکے تو وہ آدمی فٹے فوراً قتل کر دے۔

بالی نے مجھے جو نقشہ دیا تھا وہ اس لئے تھا کہ میں اس نقشے کی مدد سے نہ صرف یہاں سے فرار ہو کر کسی قریبی بڑے شہر میں پہنچ جاؤں بلکہ یہ نقشہ اویس کے حوالے بھی کر دوں تاکہ پولیس فوری طور پر کارروائی کر کے بد نصیب اور ستم زدہ لوگوں کو اس جہنم سے نکالے۔

بالی زیادہ دیر نہیں رکی کیونکہ بیگم جمال سے اس کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہو چکا تھا اور وہ اس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ بیگم جمال کے خوف کی وجہ سے میرے ساتھ فرار ہو کر میرے لئے کوئی سمیت کھڑی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے انہی نے مجھے شکار کے دوران ہی فرار ہونے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ منصوبہ زیادہ آسان تھا۔

میں بالی میرے لئے بیڈی لے کر آئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ رات اس کے ذہن میں ایک نادر تدبیر آئی ہے کہ شکار والے روز وہ توں کو کسی نہ کسی طرح بے چھوٹی کی دوا کھلا دے گی۔ کتے دوائی کھانے کے ایک دو گھنٹے کے بعد جنگل میں کسی جگہ بے ہوش ہو جائیں گے۔ اس طرح ایک بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا۔

شکار کے اس مکمل میں سب سے بڑا خطرہ کتوں کا تھی۔ بالی نے جو تدبیر سوچی تھی وہ بڑی لاجواب تھی اس طرح میرے فرار ہونے میں اور آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ میں رامو اور ڈاکٹر سے بھی منت سکتا تھا اس لئے کہ میرے پاس چاقو اور پستول تھا۔ گپ اند میرے میں امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔ ان دونوں خبیثوں کو اس دنیا سے نیست و نابود کرنا بے حد ضروری تھا۔

ناتشے کی میز پر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”رات شکار کا مکمل کیسا ہے؟“

”وہ مکمل نہ تھا شکار نہ تھا بلکہ ایک بھونڈا مذاق تھا۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

وہ ان کے کپڑے دھو تیں، کھانے پکاتیں اور اناج اور عمارتوں کے کمروں کی صفائی کرتی رہتی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک فرار ہونے کی کوشش میں زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں تھیں۔

اس نے نہ تو مجھے بالائی منزل کے بارے میں بتایا اور نہ ہی اوپر لے گیا۔ بالی نے مجھ سے پھر کے وقت بتایا کہ بالائی منزل پر پہنچنے کی طرح بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں لانچوں اور میزوں سے لونا ہوا مال رکھا جاتا ہے۔ پورچی خانہ اور مشور روم بھی ہے۔ اس عمارت کے عقب میں ایک اور عمارت ہے جس میں ایک چھوٹا سا ہسپتال ہے۔ میں نے فک کیا کہ اس کے دفتر میں بیٹھنا اس کے ساتھ باتیں کرنا بہانہ بننے کے بعد میں سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ قیلولہ کرنے کا بہانہ اس لئے کیا تھا کہ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ یہاں جو بد نصیب لوگ قید تھے انہیں اس جہنم سے جلد از جلد نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص دنیا کے ذہین ترین لوگوں میں سے تھا مگر یہ شخص شیطان صفت نہ ہو تا تو انسانیت کو بڑا فائدہ پہنچتا۔

☆-----☆

سہ پہر کے وقت بالی میرے کمرے میں آئی۔ میں نے کھڑکی میں سے ایک چھوٹی سی عمارت کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا کہ یہ کون سی عمارت ہے۔ اس نے بتایا کہ اس میں ایک پلانٹ لگا ہوا ہے۔ اس پلانٹ میں انسانی جسم سے نہ صرف کمال اتاری جاتی ہے بلکہ اسے ٹیکسیکل سے محفوظ بھی کر لیا جاتا ہے اس عمارت میں ٹیرری بھی ہے۔

شام کی چائے ہم چاہوں نے مل کر پی۔ میں نے دیکھ کر کیا کہ بیگم جمال کو بالی کا ساتھ بیٹھنا چاہئے پینا اور ڈاکٹر اویس کا اس سے بہا بہا بات کرنا سخت ناگوار لگ رہا ہے۔ وہ شعلہ بار لگا ہوں سے بالی کو دیکھ رہی تھی۔ بالی اس کی نفرت اور غصے سے محفوظ ہو رہی تھی۔ اسے مزید جلانے کے لئے وہ ڈاکٹر سے لگاؤ سے باتیں کرنے لگی تھی اور وارفتہ انداز سے دیکھ بھی رہی تھی۔ رات کے کھانے تک ہم چاہوں تاش کھیتے رہے۔

رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر، رامو کے ساتھ شکار کھینے کے لئے چلا گیا۔ آج دو بد نصیب آدمیوں کے ساتھ دو دونوں شکار مکمل رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بالی کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اس کے انتظار میں سو گیا۔ بالی نے رات تین بجے مجھے گہری نیند سے بیدار کیا۔ اس نے بتایا کہ رامو کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہی آکر سویا ہے۔ اس نے مجھے ایک بے حد خوفناک قسم کا چاقو دیا جس کا پھل انتہائی زہریلا تھا۔ ایک نقشہ، پھل تارچ، پستول

”اگر آپ کا یہ پہنچ ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سونے کے گہرے میں قید رہنے سے بہتر ہے کہ آزادی کی موت نصیب ہو۔“

”ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ کون فاتح ہو گا۔“ وہ بولا۔ ”اس لئے کہ آپ بھی شکاری ہیں اور میں بھی شکاری۔ آج ہم اپنی اپنی ساری ذہانت اور تجربے اس کھیل پر صرف کر دیں گے۔ شکار کا کھیل شلرنج کے کھیل کی طرح ہوتا ہے۔“

”شرات پر کیا ہو گا؟ کیا آپ شرافت سے اپنی شکست تسلیم کر لیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کھیل فریق کی موت پر ختم ہو گا چاہے اس میں دس دن کیوں نہ لگ جائیں۔“

”بالفرض محال میں اس کھیل سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تب آپ کیا کریں گے؟“

”ایسا ہونا ممکن ہے۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”آج تک یہاں سے کوئی بچ کر گمانے نہ جانے گا۔ ایک مشتاق چوہدری ضرور نکل گیا تھا مگر وہ زندہ نہیں بچ سکا۔ آپ بھی امید رکھ کر نکال دیں۔“

”آپ کی موت پر کیا ہو گا؟“

”میری موت کے بعد رامو اس جزیرے کا مالک ہو گا۔ اتفاق سے وہ بھی مر جاتا ہے تو آپ اس جزیرے کے مالک ہوں گے۔“

”میری اولدین کو شش پہ ہو گی کہ میں آپ کو اور رامو کو اس دنیا سے جیت دتا ہوں اور اس کو اس کا قاتل کر دوں کہ آپ دونوں معذور اور ابلہ ہو جائیں اور ڈھاکہ شہر کے کسی لڑے چوراہے پر لے جا کر ڈال دوں۔ ادھر سے جو شخص گزرتے وہ آپ دونوں کو اٹھائیں اور جوتے مارے آپ کے منہ پر تھوک کے پتھڑا بیل کر سکتا ہو کرے۔ جتنی اذیت دے سکتا ہو دے۔ یہی آپ کی سزا ہے۔“

میری یہ باتیں سننے کے بعد وہ ہنسنے لگا۔ بیکم جمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد بولا۔ ”آپ کی ان نفرت انگیز باتوں سے میں مشتعل ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ لیکن اس شکار کے کھیل میں آپ کو اس بات کی اجازت دوں گا کہ آپ کوئی ایک ہتھیار اپنے ساتھ لے سکتے ہیں مثلاً رولور، پستول، چاقو، چھریا بندوق..... اس کے علاوہ اس فخر اور اک اور جوتے بھی پسند کے مل سکتے ہیں۔“

”مجھے ایک بھرا ہوا رولور اور دس چندرہ گولیوں کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ دونوں آلو کے شے تھے، وہ دونوں جنگل کے اندر داخل ہو کر ایک درخت کے پاس ڈر اور سہم کر بیٹھ گئے۔ شکار میں مدد نہیں آیا۔ ان دونوں نے میرا موڈ آف کر دیا۔“

”آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا..... کیا انہیں واپس لے جا کر زنداں میں ڈال دیا؟“

”رامو کے چاقو نے ان کا کام تمام بڑی آسانی سے کر دیا۔ وہ دو آدمی مل کر بھی رامو پر قابو نہ پاسکے۔“ وہ مسخرے بولا۔

”رامو کو دو کپڑا آدمی بھی قابو نہیں کر سکتے۔ وہ شیر بنگال ہے۔ شیر ہیر ہے۔ فولادی آدمی ہے۔“ بیکم جمال درمیان میں بولی۔

”میں اپنا موڈ درست کرنے اور شکار کے کھیل کا لطف دوپالا کرنے کے لئے آج کی رات دنیا کا اور اپنی زندگی کا سب سے سنسنی خیز شکار کھیلوں گا۔ وہ ایسا شکار ہے کہ اس کے مقابلے کا شکار دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ شکار کا مزہ اسی وقت آتا ہے جب شکاری میں جرات، ذہانت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں چالاکی ہو۔ وہ بے حد بڑبڑ بھی ہو اور اسے اپنی جان کی پروا نہ ہو۔“

”کیا ایسا شکار آپ کے پاس موجود ہے؟“ میں نے توں پر کھنکھاتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی ہاں ہے۔“ وہ معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ ”میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ آپ سے خطرناک شکار اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟“

میرے بدن پر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ”تو آپ آج کی رات میرا شکار کھیلنا چاہتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میں اصولی طور پر تین دن اسے اپنے شکار کو جو جانوروں کا شکاری ہوتا ہے اپنے پاس شاہی مہمان کی طرح رکھتا ہوں اور اس کی ہر طرح خاطر مدارات کرتا ہوں۔ میں اپنے آپ اس اصول کو توڑ رہا ہوں۔ آج ہی آپ سے شکار کا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ آپ بھی اس کھیل میں بہت لطف محسوس کریں گے اس لئے کہ دنیا کے دو بہترین ذہین اور بڑے شکاری ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء ہوں گے۔ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا سنسنی خیز اور خطرناک شکار نہیں کھیلنا ہو گا۔ ایک طرف میں رامو اور میرے شکاری تھے ہوں گے۔ دوسری طرف آپ ہوں گے..... آپ جو دس ذہین آدمیوں پر بھی بھاری ہیں۔“

”ایک خاکی جوڑا چاہئے جو حکاری پہننے ہیں۔ جو تے ایسے چائیں جو کیوس کے ہوں نہ سے نشان اتنے مدھم پڑیں کہ نظریں آئیں۔ اس سے آواز بھی پیدا نہ ہو۔ خوراک میں پنیر، بنتریت، ابلے ہوئے انڈے، کھن، کورنا زہ پاؤرونی (ڈنل روٹی) ہو۔ ایک تھیلا بھی چاہئے۔ قمر میں میں چائے بھل جائے تو اچھا ہے۔“

”آپ حکارے کھیل پر جارہے ہیں یا کھیلکے پر.....؟“ بیگم جمال نے پوچھا۔
”آپ اسے کچھ بھی سمجھ لیں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ کھیل ایک دن ا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کتنے دن تک جاری رہے؟“

”میں آپ کو اس کھیل میں ایک رعایت دے رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ سر پہرے وقت یہاں سے نکل کر جنگل کی طرف جائیں گے۔ میں ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے روانہ ہوں گا۔ آپ اس موقع سے متناقدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھالیں۔“

سر پہرے وقت بالی نے ایک خاکی لباس اور کیوس کے جوئے لاکر دیئے کہ میں انہیں پہن کر اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے چلوں۔ میں نے لباس تبدیل کرنے اور جوئے پہننے کے بعد بالی کو پستول، پنسل، ٹانچ، نقش اور چاقو اپنے لباس میں چھپالے۔ بالی بہت خوفزدہ اور پریشان ہو رہی تھی اور میری کاسیائی کے لئے دعا بھی کر رہی تھی۔ میں نے ات تلی دی کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھے اس نے چاقو اتاری ہی یہ کھیل بیٹھ کے لئے ختم ہو جانے لگا۔

میں بالی کے ساتھ کمرے میں پہنچا تو وہاں بیگم جمال، رامو اور ڈاکٹر موجود تھا۔ میز پر میرا مطلوبہ سامان رکھا تھا۔ قلعے میں کھانے کا سامان تھا۔ میں نے رپو الوور دیکھا وہ بھرا ہوا تھا۔ میں کو لیاں الگ سے تھیں۔ پھر میں ڈاکٹر سے الوداعی مصافحہ کر کے رخصت ہوا۔ رامو مجھے اپنے ساتھ لے کر جنگل کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

بالی نے مجھے اس جنگل کے بارے میں مختصر طور پر کچھ معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اگر نے بتایا تھا کہ اس جنگل کے اندر دو تین جنگلوں پر ولد لیں ہیں۔ دو بد نصیب آدمی اور دلدلوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ انہیں رامو موت کی دلدل کتا ہے۔ اس کے علاوہ دو تین گنا پر کیا میں بنی ہوئی ہیں جو اس بات کی نشانی ہیں کہ دریا کا ناموہ قریب ہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کیا میں کوئی نہ کوئی مسلح آدمی یا رامو ضرور موجود ہو تا ہے تاکہ حکارے کا خاتمہ کیا سکے۔ رامو حکاری کو پستول کی گولی کے بجائے چاقو چرسے سے قتل کرنا پسند کرتا ہے۔ حکا

اٹھنا ڈھلکاتے ہیں۔ وہ اس وقت سکتو سے مدد لیتا ہے جب حکارے کو حاشیہ لے لے میں ۱۱ مہم جااتا ہے۔

میں جنگل کے اندر جیسے جیسے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بڑھتا گیا وہ بے روشی معدوم ہوئی مٹی اور اندر مرا مجھے اپنی لپٹ میں لیتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گھپ اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جیب سے پنسل خارج نکالی اور اس کی روشنی کی مدد سے آگے بڑھنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے شک سا ہوا تو میں نے رک کر زمین پر تارچ کی روشنی پینکلی۔ کیوس کے جوئے ایسے تھے کہ ان کے مخصوص قسم کے نشانات نرم اور اگلی مٹی پر واضح اور صاف تھے۔ یعنی سیاہ تھے۔ یہ کہ وہ دونوں ان نشانات کی مدد سے میرا تعاقب کرتے ہوئے مجھے آئیں گے۔ یہ جوتے دے کر اس نے میرے ساتھ ایک طرح سے لربہ کیا تھا۔

اس کہنے کے کئے کے مطابق وہ چار گھنٹے کے بعد میری تلاش میں نکلے والا تھا۔ وہ کسی بھروسے کے قابل نہیں تھا اور چار گھنٹے کے بعد بھی میرے تعاقب میں آسکتا تھا۔ پھر میرے اہل میں ایک تدبیر آئی۔ پھر میں نے یہ کیا کہ تدبیر کے نشانات سے بھول بھلیاں سی پیدا کر دیں تاکہ وہ بے وقوفوں کی طرح نشانات کے پیچھے جھک کھاتا رہے۔ اس طرح مجھے وقت مل جاتا کہ میں دور نکل جاؤں۔ اس طرح کی بھول بھلیاں لومڑیاں پیدا کر دیتی تھیں۔ لومڑی سے زیادہ عیار اور ہالاک جانوہر کھائی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اچھے اچھے اور ہوشیار حکاریوں کو بھی بے وقوف بنا جاتی ہے۔

اس جنگل میں چھوٹی بڑی اور خاصہ رجمڑاڑی بہت ساری تھیں جس کی وجہ سے مجھے تیز چلنے اور مختلف راستوں میں پیچکر کھانے سے نہ صرف دشواری ہو رہی تھی بلکہ میرے ہاتھ اور چہرے پر ان کی رگڑ سے خراشیں آئی تھیں اور میرے کپڑے بھی دوا یک جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اگر میرے پاس پنسل تارچ نہ ہوتی تو میرے لئے راستے ملے کرنا سخت دشوار ہو جاتا۔ ہر ایک میں نے اپنے دشمن کو الجھانے کا کام جاری رکھا۔ اس طرح مجھے تین گھنٹے گزر گئے۔ وہاں ایک تک میرا شکاک رکرنے کے لئے یہاں نہیں آیا تھا اور نہ ہی مجھے کچھ اندازہ ہو سکا تھا کہ میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔

ایک دوسری تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ دشمن کو چالوں ہی سے بے وقوف بنایا جاسکتا تھا۔ میری ذہانت اور تجربے کا اصل امتحان تو اب تھا۔ میں ایک درخت کے پاس پہنچا جو بہت بوڑھا تھا اور مضبوط بھی تھا۔ اس کی گھٹی شاخیں دوسرے درخت کی شاخوں سے

باہم ملی ہوئی تھیں۔ مجھے اب نازن کی طرح ایک درخت سے دوسرے درخت پر جانا تھا یہ کام ذرا مشکل تھا مگر ناممکن نہیں۔

میں نے تجلیے کو گلے میں لٹکایا اور درخت پر چڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ اگر پر میرے جو تان نشان نہ آئے پائے۔ میں درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی شاخوں کی مدد سے دوسرے درخت کی شاخوں کو پکڑ کے اس پر جانے میں میں منٹ لگ گئے۔ جب میں تیسرے اور چوتھے درخت کو سر کیا تو اس میں پورے بیس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔

پانچویں درخت پر بیٹھ کر میں سستانے لگا۔ مجھے دراصل کسی ایک کی تلاش تھی۔ مجھے شکار کے کھیل سے زیادہ دریا کے کنارے سے دلچسپی تھی۔ میں ساحل پر پہنچ کر دریا میں تیرتا ہوا کسی گاؤں کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں تیر کے گاؤں تک پہنچنا میرے لئے آسان تھا اور میں چھ سات گھنٹے تک بڑی آسانی سے تیر بھی سکتا تھا۔ اندھیرے میں تیرنے سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے درخت سے اتر کے اپنا سفر جاری رکھا۔ میں بڑے عرصہ بعد آواز سے قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا اور اس بات کی کو خوش بھی کر رہا تھا کہ میرے قدموں کی آوازیں بلند نہ ہوں۔ میں چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ اس جگہ پر ایک تالاب تھا۔ میرے پاس ٹارچ نہ ہوئی تو میں اب تک اس تالاب کے اندر راتر جا گیا۔ اس تالاب کی سطح پر سکون سی تھی۔

مجھے اس وقت بڑے زور کی ہموک لگ رہی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں تالاب کے پاس ایک جگہ صاف کی اور وہاں بیٹھ کر میں نے سلائی پر کھنکھار بنزیر نکالا۔ پھر میں نے ڈبل ڈیکر سینڈویچ بنایا اور رکھانے لگا۔ چاروں طرف گھبراتا چھایا ہوا تھا۔ آس پاس جھینگڑ اور کھڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دور کبیں پر ندے پھر پھڑپھڑا رہے تھے۔ چاروں طرف فضا میں وحشت سی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کس سمت چلنا چاہیے۔ دور بہت دور روشنی دکھائی دے رہی تھی جو درختوں سے چھن رہی تھی۔ پانچویں تاریخ کے چاند کی چاندنی تھی جو سب جہ زد اور بھیجی بیجی سی تھی۔

میں نے تھرموس سے نکال کر چائے پی تو بدن میں توانائی سی آگئی اور میں تازہ دم ہو گیا۔ میں تجلیے میں سامان رکھ رہا تھا کہ میرے سارے بدن اور انگلیوں کے پوروں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ایک آہٹ سی سنی، گونگی اتر رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی نے میرے

دھنن کو میری موجودگی کی خبر دے دی تھی۔ میں نے ٹارچ آف کر کے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرے ہاتھ میں وہ خوفناک شکاری چاقو آکھیا جو پانی نے مجھے دیا تھا اور جس کا پھل زہر میں بجا ہوا تھا۔ میں نے تجلیا دہاں چھوڑا اور ایک منٹ کے کھڑا ہو گیا۔ ایک قریبی درخت کے پاس کھڑے بائیں ہاتھ میں ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

میں نے اپنے کان اس طرف لگا دیئے تھے جس طرف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں نے درخت کے تنے کی آڑ سے جھانکنا اور اپنی سانس روک لی اس لئے کہ آوازیں بہت قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چیز جھاڑیوں میں سے راستہ بناتی ہوئی لگی اور مجھ سے دو قدم پر سے گزری تو میرے سارے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پچان بھی لیا تھا۔ یہ لمون رامو تھا۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح دھنکتا ہوا آیا تھا اور اس کے منہ میں ایک خوفناک چاقو دبا تھا۔

وہ دو قدم آگے چل کر رک گیا۔ وہ کسی جانور کی طرح زمین کو سوجھنے اور دیکھنے لگا۔ شاید اس کے منتوں میں کھانے کی خوشبو پہنچ گئی تھی اور اس خوشبو نے اسے میری موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ وہ ایک دم سے سیدھا ہوا کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں چاقو پھل رہا تھا وہ تیزی سے چاروں طرف گھوم کر مجھے مستلائی نظروں سے دیکھنے لگا اندھیرے میں اس کا چہرہ بد صورت اور خوفناک لگ رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی لال لال آنکھیں کسی شکاری کتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کسی درندے کی طرح انسانی خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور اس کے حلق سے کتے کی سی غراہٹ نکل رہی تھی۔

میرے لئے اسے قتل کر دینا چنداں مشکل نہیں تھا میری جیب میں بھرا ہوا پستول موجود تھا میں اس پستول سے اسے بڑی آسانی سے شوٹ کر سکتا تھا مگر یہ سراسر بڑلی تھی اور ایک مرد کی شان کے خلاف تھا۔ میں اس طرح اپنی مراد لگی کی تو بین کرنا نہیں چاہتا تھا اور پھر مجھے خون خرابا بھی پسند نہ تھا میری یہ خواہش تھی کہ وہ میری تلاش میں آگے بڑھ جائے اور میں اپنا راستہ لوں۔

اس کی نظر میرے بیگ پڑی تو وہ اس طرف تیزی سے پکا اس بیگ میں پستول کھانے کی چیزوں کے علاوہ نقشہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اب اس کو سچا ہوا بھی نہیں رہا تھا کہ میں اسے لگا دوں اور بیگ اٹھانے نہ دوں۔ اس کے بیگ اٹھانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ پستول

سے مسلح ہو جاتا۔ پھر اس سے میرا مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا۔

میں اس کی پشت پر تھا میں درخت کی اوٹ سے نکل کر دھاڑا۔ ”رک جاؤ.....
شیطان مردود.....“

وہ بیک اٹھانے کے لئے جھک چکا تھا میری دھاڑ سننے ہی وہ سیدھا ہوا اور میری طرف گھوم گیا۔ میری طرف کسی دشمنی و درندے کی طرح غراتا ہوا بڑھا۔ معلوم نہیں اندھیرے میں اس کے چہرہ کو کس چیز کی ٹھوک لگی، وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا زمین پر گر گیا اور کسی گیند کی طرح لڑھکتا ہوا تالاب کے پانی میں اس تیزی سے جا گر کہ فضا میں غزاپ جیسی تیز آواز بلند ہوئی جیسے اس نے بلندی سے پانی میں چھلانگ لگائی ہو۔

اس کے پانی میں گرتے ہی پانی میں ایک پھل کی سی جگہ گئی ایسے کچھ طوفان سا آگیا ہے۔ دوسرے لمحے اس کی ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی پھر وہ زور زور سے ترے، چپنے چلانے لگا پہلے میں یہ سمجھا کہ اس کے ہاتھ میں جو چاقو تھا شاید وہ اس کے بدن کے کسی حصے میں بیست ہو گیا ہے۔ میں نے تالاب پر نارنج کی روشنی ڈالی پھر میں نے جو دل خراش نظارہ دیکھا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

میں اپنی جگہ دم بخود کھڑا ایسا منظر دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں خواب و خیال میں کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا اس تالاب میں بلاشت سے ذرا بڑی سفید چھلیاں جو سینکڑوں کی تعداد میں تھیں وہ رامو کے بدن کو فضا میں اچھل اچھل کر اس طرح سے نوج رہی تھیں جیسے گدھ مردار کے جسم کو نوچتا ہے یہ گوشت خور چھلیاں تھیں اور نہ جانے کب سے بھوکی تھیں۔ ادھر رامو تھا کہ اذیت سے بری طرح تڑپ اور پوری قوت سے چیخے جا رہا تھا اور یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑا کر تالاب سے باہر نکل آئے۔ وہ اپنی اس جدوجہد میں بری طرح ناکام رہا اور اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہل نہیں سکا۔ سینکڑوں چھلیوں نے نہ صرف اس کا راستہ روک دیا تھا بلکہ اوپر سے نیچے تک کتنی ہی جگہوں سے گوشت کھا رہا تھا۔ اندر سے اس کی ہڈیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کی مدد کروں پھر خیال آیا کہ میں اس کی کس طرح سے مدد کر سکتا ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ سزا تو قدرت کی طرف سے اسے مل رہی ہے۔ یہ مکافات عمل ہے اس نے دنیا میں بھی اپنے کسی سزا پائی اور آخرت میں بھی پائے گا اس مردود کے لئے اس سے بڑی دردناک سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں.....

دس منٹ کے بعد پانی کی سطح پر رامو کا ڈھانچہ تیر رہا تھا۔ آدم خور چھلیوں نے اس میزے سے اٹھایا تھا کہ میں شدید رقا۔ اس خوش منظر کی بابت مجھ پر ایسی طاری ہوئی کہ میرے پیر زمین میں گڑے گڑے اور میں جیسے پتھر کا بن گیا تھا۔ چھلیاں رامو کو چٹ کر کے تالاب کے اندر پلٹی گئیں اور پانی کی سطح پھر زسکون سی ہو گئی۔ رامو کا ڈھانچہ کنارے پر آ کر روک گیا۔

قریبی درخت سے ایک پرندہ بچڑ بچڑا کے اڑا تو میں ہنگامہ پھر میں نے اپنا تھپلا اٹھا کر کندھے سے نکالا اور مخالف سمت چل پڑا چلتے چلتے میں رامو کے بارے میں سوچنے لگا جو ایک فولادی جسم کا ادنیٰ تاجس کو اپنے بازوؤں اور اپنی طاقت پر بڑا غرور و تکبر تھا۔ ذہین اور چالاک تھا معلوم نہیں اس نے کتنی معمول جانوں کو درندگی اور سفاکی سے موت کی نیند ملا دیا تھا آج وہ مراحمی تو کیسی عبرت انگیز موت تھا۔

میرے دل کے کونے میں چاہک جو خیال آباد یہ تھا کہ ڈاکٹر کہاں ہے۔ ڈاکٹر یقیناً رامو اور کتوں کو ساتھ لے کر نکلا ہو گا۔ کتنے شاید بے ہوشی کی دوا کی وجہ سے رہ گئے ہوں گے۔

ڈاکٹر اب تک اس کھیل میں شریک کیوں نہیں ہوا، شریک ہوا ہے تو وہ میری تلاش میں کیوں نہیں چل پڑا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میزے گھات میں کسی جگہ چھپا بیٹھا ہو اس نے رامو کی دردناک چیخیں سنی ہوں گی۔ نہ سننے کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ دل دہلا دینے والی چیخیں جنگل کے گہرے اور پُر ہیبت ستارے میں دو درود رنگتے ہوئے گئی تھیں۔ ان چیخوں سے اس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اس کا عزیزاں جان دوست رات میرے ہاتھوں بڑی بے رحمی سے نشانہ بن رہا ہے اور تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے رہا ہے۔ اس کا چیخوں کو سن کر رامو کی مدد کو نہ آنا میرے لئے حیران کن تھا یا پھر وہ کسی خوف یا کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے نہیں نکلا تھا۔ اب اس کا شیطانی ذہن میرے ساتھ شاطرنہ کھیل کھیلے اور رامو کی موت کا بھیاں تک انتقام لینے کا سوچ رہا ہو گا۔ میں نے اس شطرنج کے کھیل کے آغاز میں اس کا سب سے بڑا اور اہم مہر بیت کر رکھ دیا تھا۔ اب مجھے اس سے بہت ہو شیار اور چونکا رہنے کی ضرورت تھی۔ اس کا اس جنگل میں مجھے تلاش کرنا مشکل نہ تھا اس لئے کہ وہ اس کے چپے چپے سے واقف تھا اور تمام پیچیدہ راستوں سے بخوبی واقف تھا۔

رامو کی موت سے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی کوئی اور موقع ہو تا تو شاید میں خوشی میں مرشار ہو جاتا۔ اس مسرت کی وجہ یہ تھی کہ ایک زبردست خطرہ ٹل گیا تھا لیکن اس سے

کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا اس کی آنکھیں دہشت سے پٹی ہوئی تھیں اور چہرہ سفید پڑا چلا گیا تھا۔ چوکی کے پاس ایک صاف ستھری پلاسٹک کی بائلی رکھی تھی۔ ڈاکٹر ایک کونے میں کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک تیزو حاد والا پھرا تھا۔ اس نے چہرے کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد پکڑا ایک طرف پیٹھک دیا اور چوکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ ایک انسان کا چہرہ نہ تھا ایک وحشی درندے کا تھا جو انتہائی ہمایک اور مکروہ تھا۔ چہرے پر سٹاکی تھی اور آنکھوں میں سے درندگی جھانک رہی تھی وہ اس لڑکے کو گھور رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں دھتیاں چمک نکل رہی تھی۔

”تم..... تم..... کیا کرنا چاہتے ہو۔“ لڑکے نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

”میں.....؟ میں تمہیں ذبح کر کے تمہارا خون پینا چاہتا ہوں۔“ اس کے ہونٹوں پر انتہائی مکروہ مسکراہٹ چمیل گئی۔ ”میں نے سنا ہے کہ انسانی خون آب حیات لئے کم نہیں ہو۔“ میں تمہارا خون پی کر تجربہ کرنا چاہتا ہوں پھر تمہارا گوشت بمون کر کھا جاؤں گا.....“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ بلیانی انداز سے پچاس اس کی حالت ہسٹیلی مریض کی سی ہونے لگی۔ ”میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے تمہارا کیا کیا ڈا ہے مجھے چھوڑ دو“ مجھے معاف کر دو۔“ وہ گڑگڑا لگا۔

”معاف کر دو؟“ وہ استہزائی انداز سے ہنسا۔ ”معافی کا لفظ پہری لغت میں نہیں ہے نہ میں کسی کو معاف کرنے کا قائل ہوں اور نہ میں معافی کو مردانگی سمجھتا ہوں۔ معافی صرف بزدل مانگتے ہیں تم کس بات کی معافی مانگ رہے ہو؟“

”میں..... میں تم سے رحم کی التجا کر رہا ہوں..... میں انسان ہوں ذبح انسانوں کو نہیں کیا جاتا ہے۔ تم کیسے انسان ہو جو ایک انسان کو ذبح کرنا چاہتے ہو؟ خدا کے خوف سے ڈرو.....“

”جب انسانوں کو گولی یا چاقو چہرے سے قتل کیا جاسکتا ہے تو اسے ذبح کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ قتل کرنا اور ذبح کرنا ایک ہی بات ہے۔ میں نے قتل تو بہت کئے ہیں۔ کسی انسان کو ان کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ تم بڑے اچھے موقع پر ہاتھ لگے۔“

”پلیز..... پلیز.....“ وہ رونے لگا۔ ”خدا کے لئے..... میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے میرے ماں باپ، بھائی، بہن، میرے غم میں مر جائیں

بڑا اور اصل خطرہ ڈاکٹر کی صورت میں موجود تھا اور اس خطرے پر قابو پانا سب سے بڑی بھادری تھی اور کمال تھا۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ میں اس شیطان کو ہر قیمت پر کیفر کردار تک پہنچاؤں۔

اس بات کا امکان تھا کہ وہ شیطان میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور کسی بھی لمحے مجھے اپنا نشانہ بنا سکتا ہے۔ وہ اب تک میرے سامنے یا مقابلے پر اس لئے نہیں آیا تھا کہ مجھ پر نفسیاتی حربے آزماتا چاہتا تھا کہ میں اس کے خوف سے بھاگتا رہوں۔ وہ مجھے ہراساں اور پریشان کر کے لطف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک شکاری کو شکار بنا کر اسے موت کے منہ میں پہنچانا چاہتا تھا۔

میری اپنی غایت اس میں تھی کہ میں چلتا رہوں میرا میاں بھرنا میرے لئے کسی بھی صورت میں مناسب نہیں تھا۔ یوں بھی ایک خطرہ سامنے ڈالنا محسوس ہوتا تھا۔ میں مخالف سمت چل پڑا تو زوی دور چلنے کے بعد مخالف سمت کسی قدر دو قاصدے پر درختوں کے بیچ سے پھینکی سی چاندنی جھانکتی نظر آ رہی تھی میں نے اپنا رخ اس طرف کر لیا۔

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا بڑھنے لگا میں نے اپنی ناریج بھی روشن نہیں کی اس لئے کہ ڈاکٹر کو میری موجودگی کا پتا چل سکتا تھا۔ میں ان درختوں سے قریب ہوتا جا رہا تھا کہ ایک چیخ سی سی ہر انسانی چیخ تھی جو فضا میں بلند ہوئی یہ کسی نوجوان لڑکے کی چیخ تھی۔ میں اس چیخ کی آواز کی سمت بڑھا تو میرے ذہن میں کئی سوالات کیڑوں کی طرح کھیلانے لگے کہ یہ لڑکا کون ہے؟ جنگل میں کہاں سے آگیا؟ وہ کس لئے چیخ رہا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا جنگل کی خاموش فضا اس کی دہشت ناک چیخوں سے گونجنے لگی۔

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی چند لمحوں کے بعد میں ان درختوں کے پاس پہنچ گیا جہاں چاند کی روشنی چھن رہی تھی۔ ان درختوں کے بیچ ایک بہت بڑی جگہ کھلی ہوئی سی تھی ایک بہت ہی چھوٹا سا میدان تھا اس کی زمین ہموار اور صاف تھی اس جگہ ایک کنیاسی بنی ہوئی تھی۔ اس کنیاسے اندر سے اس لڑکے کے چیخنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے اذیت دی جا رہی ہو۔

میں دسے پاؤں اور بے آواز لٹکیا کے پاس پچاس کی چٹائی کی دیوار میں بہت سارے روزن نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک روزن سے اندر جھانکا اس کے اندر ایک چوکی تھی۔ طاق پر ایک بڑی سی لائین روشن تھی۔ میں نے اس کی روشنی میں دیکھا۔ ایک سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان اور خوبصورت سا لڑکا رسیوں سے اس طرح بندھا ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ

اس نے میرے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی لیت و لعل نہیں کیا اور پورا کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی اس میں ایک بنوا چھاپوں کا گچھا اور

گا۔ تم رامو کو نہیں جانتے سالار! یہ صرف میں جانتا ہوں کہ وہ کیا خطرناک 'ڈپن' اور چالاک شخص ہے۔ اس میں کتنی صلاحیتیں ہیں اس کے علاوہ وہ ایک بہترین شکاری بھی ہے۔ تھوڑی دیر کی بات ہے وہ تمہارا اس عارضی فتح کو بھریں خاک میں ملا کر رکھ دے گا..... صبح کے ناشتے میں ہم تمہارا اور اس لڑکے کا گوشت بھون کر کھا رہے ہوں گے۔"

اس کی بات سن کر اقبال کا چروہ پی ہو گیا۔ وہ مجھ سے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "آپ اس موڈی کو کوئی کیوں نہیں مار دیتے..... یہ شیطان زندہ رہنے کے قائل نہیں ہے..... یہ رامو کون ہے؟" اس کے سینے میں سانسوں کا طغیانی پیدا ہو گیا تھا۔

"تم فکر نہ کرو یہ ہمارا بال تک نہیں کر سکتا۔" میں نے اقبال کو دلا سا دیا پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "تم جس رامو پر اتنا بھروسہ اور ناز کر رہے ہو وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ قدرت نے اس ذلیل اور غیبت سے ایسا بھی ایک انتقام لیا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کاش! قدرت تم سے اس سے کہیں زیادہ خوفناک انتقام لے....."

"تم جھوٹ بول رہے ہو تاکہ میں رامو کی موت کی خبر سن کر خوفزدہ 'پریشان' اور غمگین ہو جاؤں! اپنا حوصلہ بارود اس دنیا میں آج تک اس سے انتقام لینے والا پیدا نہیں ہوا نہ تمہارا خدا اس اتنی قدرت ہے کہ اسے سزا دے سکے۔"

"تم زبان بکتے لگے۔" مجھے اس کے غرور و تکبر پر سخت طیش آ گیا۔ "میں تمہیں اس جگہ لے جا رہا ہوں جہاں وہ قدرت کے عبرتناک انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ خدا خالوں سے کیا بھی ایک انتقام لیتا ہے۔"

میرے کہنے پر اقبال نے جلتی ہوئی لالین اٹھالی۔ میں نے حفظِ متمدن کے طور پر اسے ڈاکٹر کا پستول دے دیا اور اسے ڈاکٹر پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایت کی۔ اس لئے کہ وہ ایک شاطر آدمی تھا اور اس نے اپنے آدمی جنگل میں چھپا رکھے ہوں گے وہ اس کی ایک آواز پر اس کی مدد کے لئے آتے تھے۔ اقبال خستِ مضطرب اور ہڈیاں پانی ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو قتل کرنے کے ورپے ہو رہا تھا میں نے اسے بڑی مشکل سے قابو میں کیا اور اسے اس بات پر قائل کیا کہ ہمیں قانون کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہیے اس کے جرم کی سزا اسے قانون دے گا۔ اقبال کا کمانہ تھا کہ اسے وہ سزا نہیں ملے گی جس کا یہ مستحق ہے۔ میں نے اپنا پستول اپنے ہاتھ میں رکھا اور اسے نشانے کی زد میں لے لیا۔

جب ہم تینوں کھینچے باہر آئے تو اقبال نے اس راستے کی طرف اشارہ کیا جو دو

درختوں کے بیچ میں تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ راستہ دریا کی طرف جاتا ہے اور دریا نصف میل پر ہے۔ وہاں اس کی اور ڈاکٹر کی موٹر بوس بھی موجود ہیں اور ہم اس میں سوار ہو کر فرار ہو سکتے ہیں۔ میں نے اسے مختصر طور پر بتایا کہ اس راستے اور موٹر بوس میں جانے سے کس قسم کے خطرات پیش آ سکتے ہیں۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ اس راستے سے واپس کیوں اور کس لئے جانا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر آگے آگے قربانی کے کسی جانور کی طرح چل رہا تھا۔ ہم دونوں اس سے تین چار قدم پیچھے تھے۔ لالین کی روشنی اندھیرے میں راستہ دکھائی تھی۔ چلتے چلتے اقبال نے مختصر طور پر اپنے بارے میں بتایا کہ وہ چاند پور خرمیر رہتا ہے اور اس کے گھر والے پان کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ کل شام اپنی موٹر بوس میں اپنی بہن کے سرال جانے کے لئے نکلا جو ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ بد قسمتی سے وہ راستہ بھول گیا اور بجنگ کر اوھر آ نکلا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سوچا کہ رات بھر دریا میں بھٹکنے سے تو بہتر ہے کہ کنارے آرام کر لیا جائے اور صبح ہوتے ہی نکل جائے۔ اتفاق سے اسی وقت ڈاکٹر کی موٹر بوس ادھر آ نکلی اور ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو اسے اپنے پستول کے نشانے کی زد میں لیا اور ساتھ کھینچ لے کر پچھلے پہر اگلے کے سر پر ایک ڈنڈے کی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو رسیوں میں جکڑ پایا۔ اس نے اپنے آپ کو بے دست دیا 'پاکر چٹنا چٹنا' اور ہد کے لئے کپڑا شروع کر دیا۔ وہ اسے ذبح کر کے اس کا خون چٹنا چٹنا تھا کہ میں نجات و بندہ بن کر بچ گیا۔ مجھ سے اگر ایک پل کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ ذبح ہو چکا ہوتا۔

تلااب پر پہنچ کر میں نے ڈاکٹر کو رامو کی ہڈیوں کا ڈھانچا دکھایا جو قدرت کے بھی ایک انتقام کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں نے اسے بتایا بھی کہ کس طرح سے تلااب کی آدم خور لہلیوں نے رامو کو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر لیا۔ اس ثبوت کے باوجود اسے میری بات کا یقین نہیں آیا۔ اس کے خیال میں یہ کسی مفرد شکاری کی لاش کا ڈھانچا تھا۔ اس کا کتنا تھا کہ میں اس پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لئے جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس کے خیال میں رامو لہندہ تھا اور راستے میں اس سے کسی گنڈ بھیز ہو سکتی تھی۔

میرے دل کے کسی کو نے میں یکبارگی یہ خیال آیا کہ اس مرود شیطان کو اس تلااب میں دھکا دے دوں۔ اس غیبت کے لئے اس سے بڑی سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدلتی کر دیا اور تلااب کے پاس سے کوچ کیا۔ ہم تینوں ایک قافلے کی صورت میں رکے بغیر چلتے رہے۔ صرف ایک جگہ تھوڑی دیر کے لئے رک کر ناشتہ کیا

اور چائے پی تھی۔ ڈاکٹر نے کھانے سے صاف انکار کر دیا تھا اس نے صرف چائے پی تھی۔ اس نے راستے میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی اٹھانی پڑی ہو۔ وہ تو خوش خوش چل رہا تھا جیسے اس کی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد رامو اور اس کے ساتھی اسے چھڑا لیں گے۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم مجھے میری رہائش گاہ پر لے جانے کے بعد بیچ جاؤ گے؟ میرے ساتھی تھیں بتائیں گے نہیں..... تم دونوں کی بہتری اس میں ہے کہ فرار ہونے کی کوشش کرو۔“

”یہ تمہارا خیال خام ہے ڈاکٹر؟“ میں نے اس سے ہنکار کی۔ ”تمہارے سینکڑوں ساتھی بھی میرے منصوبے کو ناکام نہیں بنا سکتے ہیں.....“

وہ معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ ”اپنے دل کی حسرت بھی پوری کر کے دیکھ لو۔“

ہم دونوں نے بہت دیر سے کوئی بات نہیں کی صرف سوچتے اور چلتے رہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے احساسات اور خیالات کو پڑھ رہے تھے۔ ہم دونوں کی سوچ دو مختلف راستوں کی طرح الگ تھی۔ ہم متفاد اور مختلف سمتوں میں سوچ رہے تھے۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ تھا میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ ڈاکٹر چونکہ اس وقت میرے رحم و کرم پر اور قید میں تھا اس لئے پڑی آسانی سے اس کے ساتھیوں اور جزیرے پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ اس کے آدھیوں پر قابو پانے کے لئے ان لوگوں سے مدد لی جاسکتی تھی جو اس کی قید میں تھے۔ یہ سنہری موقع ملا تھا اور میں اسے کسی قیمت پر ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔

اگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دھمک اور آنکھوں میں چمک تھی۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا منصوبہ تھا جس کی وجہ سے وہ پرامید اور خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس جیتی ہوئی بازی کو اٹ کر رکھ دے گا۔ کامیابی اس کے قدم چومے گی اور درود فاتح رہے گا۔

جب ہم اس گھنے اور تاریک جنگل سے نکل کر کھلی جگہ پر آئے تو سہانی صبح نے استقبال کیا۔ چاروں طرف دھوپ بھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں خشکی تھی۔ تروتازہ ہوائے جھونکوں نے بدن میں تازگی بھری تھی اور تھکن کا احساس مٹ گیا تھا۔ جنگل کا راستہ اس رہائش گاہ کے عقب میں تھا۔ میں نے اقبال کو پہلے سے بتا دیا تھا کہ اسے ہو شیار اور چوکس رہنا ہو گا۔ یہاں چھپے ہوئے اور درندہ صفت بد معاشوں سے واسطہ پڑے گا۔ اقبال

ایک نوجوان لڑکا تھا لیکن تھا وہ بڑا پیا اور نڈر۔ وہ ذرا بھی ہراساں اور خوفزدہ نہ تھا۔ اس کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اس کی بہت دیکھ کر مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ جو ڈروا کر لے بھی جاتا ہے اور اس کے پاس بلیک بیلٹ ہے۔

جس وقت ہم اس کی عظیم الشان عمارت کے اگلے حصے کی طرف بڑھ رہے تھے فضا میں بہت سارے لوگوں کا شور مچا دیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے زبردست جشن منایا جا رہا ہو اور لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے ہوں۔ یہ کس بات کی خوشی اور جشن ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ ہی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ جشن بد معاشوں کا ہے۔ شاید انہوں نے ایسی کوئی لالچ یا شیر پکڑا ہو جس میں بہت سارا مال نعمت اور لڑکیاں ہاتھ میں ہوں۔ شاید اس وجہ سے وہ خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر بھی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ وہ دو دھیمی بڑا حیران اور خوش ہو رہا تھا۔ میں عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا جا رہا تھا کہ کبیں اس کے آدی تو اس طرف نہیں آ رہے۔ پھر میں جھانپوں کے پاس پہنچ کر رک گیا اور اسے بھی روک لیا۔ اس کے سامنے آکر میں نے پتول کی نال اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے تھیلے میں دیکھا۔ ”سنو ڈاکٹر! اگر تم نے اپنے ساتھیوں کے سامنے پہنچ کر میرے کبھی بھی حکم کی خلاف ورزی کی تو میں تمہیں بلا درلج گولی مار دوں گا، تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو میرا ہر حکم ماننا ہو گا۔“

ڈاکٹر نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ معنی خیز انداز سے مسکونہ لگا۔ یہ لمحوں اس بات سے خوش ہو رہا تھا کہ اس کے آدی ہم دونوں کو کسی نہ کسی طرح قابو کر لیں گے۔ ہمیں شہادت ہو جائے گی۔ ہم موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ اس کی مکروہ مسکراہٹ نے میری جان جلادی۔ میں نے تھیلے میں سے پھراٹھال کر اقبال کے ہاتھ میں تھما دیا اور اسے بتایا کہ اس سے اسے کیا کام لینا ہے۔

ہم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے تو میرے درود ہمارے زمرے میں اس طرح سے تھا کہ اقبال نے اس کی پشت پر پھرے کی نوک رکھی ہوئی تھی اور میرے پتول کی نال اس کی ٹھوڑی میں اس طرح سے دھکی ہوئی تھی کہ اسے درد کی وجہ سے اپنی گردن اونچی کر کے چٹان پر رہا تھا۔ میری انگلی لپٹی رہی تھی۔ اس کے چہرے کی دھمک اور آنکھوں کی چمک کا درد و رشک پتا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑا چلا گیا تھا جیسے اسے اپنی نظروں کے سامنے موت کے فرشتے کھڑے نظر آ رہے ہوں۔

ہے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حالات پر پوری طرح قابو پانے کے بعد چاند پور پولیس کو بلالین پر تمام واقعات کے بارے میں بتا دیا گیا۔ چاند پور اس جزیرے کے قریب تھا۔ پولیس دوستیروں کے ساتھ دو سپرکامپنٹ ڈیوٹی تھی تاکہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ پولیس اور سپرکامپنٹ کے پیچھے سے پہلے پہلے ہم نے اس شیطان مردود کی ساری دولت جو اس کی تجویز میں بند تھی ان بد نصیب لوگوں میں مساویانہ طور پر تقسیم کر دی۔ اس تجویز میں تین کروڑ اٹھ لاکھ روپے کی مددات میں تھے۔

ہالی نے ہمارے پاس پہنچ کر ڈاکٹر کو شہر بارنگاہوں سے دیکھا اور اقبال کے ہاتھ سے مہراجپت کر اس کے چہرہ اگھوٹنا چاہتی تھی کہ کیپٹن نے بڑی بھرتی اور تیزی سے اس کا ہاتھ کھڑا کیا۔ ”نہیں ہالی..... یہ قانون کا مجرم ہے اسے قانون ہی سزا دے گا۔“

”یہ میرا مجرم ہے.....“ ہالی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ”اس نے جس طرح انسانوں کا گوشت کھایا ہے انہیں قتل کیا ہے ان کا گوشت کتوں کو کھلایا ہے“ میں بھی اس مجرم کے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت کتوں کو کھانا چاہتی ہوں۔“

ہالی انتقام میں اندھمی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کی حالت خراب سے بھی بدتر تھی۔ میں نے ہالی کے پاس جا کر اس سے کہا۔ ”تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ رامو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“ ہمیں نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح مرا..... قدرت نے کیا انتقام لیا۔

ہالی نے ایک زوردار تھپڑ ڈاکٹر کے منہ پر رسید کر دیا اور اس کے منہ پر قھوک دیا۔ ہر وہ جہان لیے ہیں ڈاکٹر سے بولی۔ ”سور“ کہتے..... تم نے ڈاکٹر کو اپنا انجام دیا..... کاش میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کر سکتی.....؟“

اس عرصے میں تمام مردوں اور عورتوں نے ہمیں گھیر لیا۔ لوگ مشتعل ہو رہے تھے۔ لڑتے اور شے سے ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ ہر شخص ڈاکٹر سے انتقام لینے پر تیار تھا۔ سرگوشیوں کی ایک ہتھمٹ تھی جو فضا میں گونج رہی تھی۔ کیپٹن نے بڑی مشکل سے تمام کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر خون کی ایک بوند بھی نہیں رہی تھی۔ وہ اسے نظروں سے اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ کھلی تک وہ اس جزیرے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ آج وہ ایک قیدی تھا۔ آج خود شکار بن گیا تھا۔

کیپٹن اور میں نے آپس میں طے کیا کہ ڈاکٹر کو کسی کمرے میں لے جا کر بند کر دیتا ہوں۔ پولیس کے آنے کے بعد اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ میں ہالی اور کیپٹن کے ہمراہ تھیں کرتے ہوئے آگے چلے گئے۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں نے کس طرح ڈاکٹر

یہ لحاظ میرے لئے ناقابل فراموش تھے اگرچہ ہم دونوں مسلح تھے لیکن ہر آن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ چاروں طرف سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی ہے۔ اس کے درندہ صفت بد معاش ساتھی ہمارے جسم چھلنی کرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ میرے اندر بھی خوف و ہراس ساتھ ساتھ ہم میں سے اس پر پوری طرح قابو پایا ہوا تھا۔

جب ہم عمارت کے سامنے والے میدان میں پہنچے تو وہاں تشدد ہی کچھ اور تھا۔ اس میدان میں ایک طرف جزیرے کے تمام بد معاش رسیوں میں جکڑے پڑے تھے اور بہت سارے زخمی بھی تھے جو درد و دواہیت سے کراہ اور تڑپ رہے تھے۔ ان کے سروں پر دو تین مسلح نوجوان کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ بہت سارے مرد لڑکیاں، عورتیں اور لڑکے میدان میں بکھرے ہوئے تھے اور آزادی اور دھوپ کا کالغ اٹھا رہے تھے۔ اس عمارت کے برآمدے میں ہالی، دو نرسوں اور دو مردوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان میں ایک مرد فوجی وردی میں بلبوس تھا۔ دو قامت کتے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ ہالی کی نظر سب سے پہلے ہم پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ حیرت اور خوشی سے دمک رہا تھا۔ چہرہ خوشی سے پھولی نہیں سائی وہ فوجی شخص کو اپنے ساتھ لے کر ہماری طرف لگی۔

ہالی نے جیسا کہ مجھے بعد میں بتایا کہ فوجی شخص جس کا نام کیپٹن ڈاکٹر کبیر احمد ہے جو اس شخصیت کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھا اور ہر فعال تھا وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس نے کیپٹن کی مدد سے اس جزیرے پر قبضہ اور ڈاکٹر کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس جزیرے پر قبضہ کرنے کے لئے رامو اور پہرے داروں کو قابو میں کرنا ضروری تھا۔ جب اس کے ذہن میں کتوں کو بے ہوشی کی دوا کھلانے کی تدبیر آئی تو پھر اس نے سوچا کہ پہرے داروں کو بھی کانی ہی بے ہوشی کی دوا کھلا کر پلائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر اس کا یہ نادر منصوبہ سن کر ہچکل پڑا تھا۔ اگر یہ تدبیر پہلے ذہن میں آجاتی تو اب تک ان بد نصیب لوگوں کو نجات مل چکی ہوتی۔ ہالی نے کانی ہی بے ہوشی کی دوا ملائی۔ وہ جتنے پہرے داروں اور بد معاشوں کو کانی پلا سکتی تھی پلا دی۔ جب یہ سارے لوگ بے ہوش ہو گئے تو کیپٹن نے جیسے کمان سنبھال لی۔ جیل خانے کے دروازے کھول دیے گئے۔ بد معاشوں کو غیر مسلح کر کے انہیں باندھ دیا گیا اور ان کے پاس جو اسلحہ تھا وہ لڑکوں اور مردوں میں تقسیم کر دیا۔ اسلحہ کم پڑا تو اسلحہ خانے سے لے لیا گیا۔ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی آزاد کر دیا گیا۔ انہوں نے چاہا تو اور چہرے سنبھال لئے پھر ساری رات آپریشن ہوتا رہا۔ بد معاشوں کو جن جن کر گرفتار کیا۔ ان میں سے کچھ نے مزاحمت کی تو وہ زخمی ہو گئے۔ دو ایک بد معاش فرار

کو قابو میں کیا اور یہ لڑاکا اقبال کون ہے اور وہ کیسے ڈاکٹر کے ہاتھ لگا۔ اقبال ہمارے پیچھے پیچھے ڈاکٹر کو لے چلا آ رہا تھا۔

ہم تینوں نے بمشکل بیس چھٹیس قدم طے کئے ہوئے اچانک فغا میں ایک دردناک جھج بلند ہوئی۔ ہم تینوں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ جھج ڈاکٹر کی تھی ایک آدمی نے اقبال کے ہاتھ سے پھر اچھین کر ڈاکٹر کی پشت میں گھونپ دیا تھا پھر اس پر دس بیس لوگ ٹوٹ پڑے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ وہ مسلح تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چاقو اور خنجر تھے۔ ڈاکٹر کی دردناک چھٹیس فضا کو دھلانے لگیں۔ میں اور کپٹین ڈاکٹر کو بچانے کے لئے بڑھے تو جھج نے ہمیں کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ ان پر جنوں سوار ہو چکا تھا۔ وہ اندھے ہو رہے تھے 'انتقام لینے کے لئے۔ ان پر قابو پانا دشوار تھا۔ ہم دونوں ایک طرف بے بس سے کھڑے ڈاکٹر کا بھیا تک انجام دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد جھج چمنا تو ایک ایسا دل خراش منظر نظروں کے سامنے تھا کہ دوبارہ دیکھنے کی جھج میں ہمت نہ رہی۔ ڈاکٹر کی لاش کے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے اور وہ زمین پر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے اور ہائی لیک کرکتوں کے پاس گئی ان کی زنجیریں کھول کر ڈاکٹر کی لاش کے ٹکڑوں کے پاس لے آئی تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔

☆-----☆-----☆

میں ڈھاکہ انڈیا پورٹ پر جہاز سے اترتا ہوں اور انجم انصاری کے رشتہ دار کے پھولوں کے ہار کے ساتھ میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس روز کے اور آج کے استقبال کے میں بڑا فرق تھا۔ انجم انصاری حسین اور جمیل جیسی گہری آنکھوں میں خوشی کے آنسو موتیوں کی طرح دک رہے تھے۔ ڈھاکہ انڈیا پورٹ پر اس روز خوشی کھیل کا جو آغاز ہوا وہ آج اس کا اختتام بھی ہو گیا تھا۔ ٹھیک اس وقت ایک دوسری کہانی نے جنم لیا۔ انجم انصاری پھولوں کا ہار لئے میری طرف اور فرزند انڈیا میں بھی اور میرے قریب پہنچ کر دی۔ پھر انہوں نے میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا تو اس کی آنکھوں میں محبت کے ان گنت چراغ جل اٹھے۔ پھر اس نے دنیا کی پردہائے بغیر میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔ میرا وجود اس کی محبت کی خوشبو بھیلی جلی گئی۔

☆=====ختم شد=====☆

تاہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندانی میں پھول

چار پیارے خولے صورت بچے جو گلاب کی پتھریوں سے بھی زیادہ نرم و نازک تھے

لحمہ بہ لحمہ بہ سطر، تجر، تجر، جنس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی خنثیوں کے دم و گرم پر پردہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بد قسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کر دیا۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

اپنے قریبی بکسٹال یا باہر کے طلبہ فرامیں یا براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادوارہ کے نام میں آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

بہترین کتابت، خوبصورت گروڈیزش اور عمدہ طباعت کے ساتھ براہ راست منگوانے کا پتہ :-

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

10، محلہ گٹ آرڈو، بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال

نسبت روزہ، چوک میوہ پتال، لاہور